ہماری اَمّی

مبارکہ حیدر

مُرتّب

شعیب حیدر

ہماری اَمّی مبارکہ حیدر

شعیب حیدر

ہماری اَمّی مبارکہ حیدر

اُس زمانے کی دو تصویریں جب امی کی عمر دو سال اور ابو کی عمر چھ سال تھی

امی کے بچپن کی ایک تصویر

ہماری اَمی

مبارکہ حیدر

مرتّب

شعیب حیدر

عکاس انٹرنیشنل پبلی کیشنز۔اسلام آباد

HAMARI AMMI MUBARIKA HAIDER

Compiled BY: Shoaib Haider

Year of 1st Edition 2015

ہماری اَمّی مبارکہ حیدر

نام کتاب: ہماری اَمی مبارکہ حیدر

مرتب: شعیب حیدر

اشاعت: 2015

ناشر: ارشد خالد

سرورق: ظہیر عباس

مطبع: BPH پرنٹرز لاہور

قیمت: 150 روپے

عکاس انٹرنیشنل پبلی کیشنز۔اسلام آباد

مکان نمبر 1164، گلی نمبر 2، بلاک سی

نیشنل پولیس فاؤنڈیشن سیکٹر O-9۔لوہی بھیر، اسلام آباد

E Mail:akkasurdu2@gmail.com

انتساب

اپنی امَی
مبارکہ حیدر کے نام

پھولوں کی ہے نرمی بھی
اس کی محبت میں
صحراؤں کی گرمی بھی

فہرست

پیش لفظ

ہماری امی مبارکہ حیدر

سب سے پہلے اپنا مختصر سا تعارف بیان کر دوں۔اردو کے شاعر اور ادیب حیدر قریشی صاحب کا بڑا بیٹا ہوں۔انہیں ہمیشہ اَبو کہتا ہوں۔اور امی کو امی کہتا ہوں۔اس لیے اس کتاب میں میری طرف سے جہاں دونوں میں سے کسی کا ذکر ہوگا، وہ انہیں الفاظ میں ہوگا۔

یکم مارچ ۲۰۱۵ء کو میرے گھر پر سارے بہن بھائی جمع تھے۔امی، ابو بھی آئے ہوئے تھے۔ ملاقات کی اس تقریب کا سبب یہ تھا کہ امریکہ سے میری پھوپھی زبیدہ کلیم آئی ہوئی تھیں۔ پانچ ہفتے جرمنی میں قیام کے بعد وہ ۳ مارچ کو امریکہ واپس جانے والی تھیں۔امی ایک عرصہ سے بیمار ہیں۔ان کی بیماریوں کی شدت میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ان بیماریوں کی نوعیت اور شدت کا ذکر ابو کی یادوں کے بعض حصوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔نئے سال کے آغاز کے ساتھ ہی امی کو بار بار ہسپتال جانا پڑ رہا تھا۔پھوپھی زبیدہ اسی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے جرمنی میں آئی تھیں۔پھوپھی اور امی ہم عمر بھی ہیں، کزن بھی ہیں اور بچپن سے ان دونوں کی باہم دوستی بھی ہے۔ان کے قیام کے دوران امی کا آدھا وقت ہسپتال میں بسر ہوا اور آدھا وقت گھر میں گزرا۔پھوپھی زبیدہ دونوں صورتوں میں امی کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔نند اور بھابی کے اس تعلق کو جتنا بھی سراہا جائے، کم ہے۔اللہ پھوپھی زبیدہ کو اجرِ عظیم عطا کرے۔(آمین)

یکم مارچ کی اس فیملی تقریب میں میکسم گورکی کے ناول ''ماں'' سے بات شروع ہوئی، چوہدری ظفر اللہ خان صاحب کی ''میری والدہ''، قدرت اللہ شہاب کی ''ماں جی'' اور ابو کے خاکہ ''مائے نی میں کنوں آکھاں'' سے ہوتی ہوئی پروفیسر جاوداں میر کی مرتب کردہ ''معراج نسیم'' (ہماری امی جان) تک جا پہنچی۔حمایت علی شاعر صاحب کی اہلیہ کی وفات کے بعد ان کی بیٹی جاوداں میر نے یہ کتاب مرتب کی۔اس میں خاندان کے مختلف افراد نے معراج نسیم صاحبہ کو اپنے

اپنے طریقے سے یاد کیا۔حمایت علی شاعر صاحب کو اپنی اہلیہ کی وفات کے بعد ان کی کمی بہت زیادہ محسوس ہوئی۔انہوں نے شاعر کی حیثیت سے ان کے بارے میں نظمیں لکھیں۔حمایت علی شاعر صاحب کی اولاد کا اپنی والدہ کو یاد کرنے اور ان کی محبت کو تازہ کرنے کا یہ ایک اچھا قلمی انداز تھا۔اس کتاب کی اشاعت سے معراج نسیم صاحبہ کی روح خوش ہوئی ہوگی۔

اس دوران جب گفتگو ہو رہی تھی تو میں نے کہا کہ جب ماں سے محبت کا کوئی قلمی اظہار کرنا ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ پہلے ماں کے مرنے کا انتظار کیا جائے اور پھر ماں کو یاد کرتے ہوئے کوئی کتاب ترتیب دی جائے۔حمایت علی شاعر صاحب کے بچوں نے جس اچھے کام کا آغاز کیا، اس روایت کو آگے بڑھایا جائے تو اچھا ہے۔اور مزید اچھا کر کے آگے بڑھایا جائے تو اور بھی اچھا ہے۔یعنی کسی کتاب کی صورت میں ماں سے محبت کا اظہار بھی کیا جائے اور ایسا کام ماں کی زندگی میں ہی کر لیا جائے۔ماں کی روح کو خوش کرنے کی بجائے کیوں نہ جیتی جاگتی ماں کو اس کی روح سمیت خوش کیا جائے۔اس گفتگو کے نتیجہ میں سارے بھائی بہنوں نے صلاح دی کہ ہمیں بھی امی کے بارے میں ایسا کوئی کام کرنا چاہئے اور ان کی زندگی میں ہی کر دینا چاہئے۔اب یہ سوچا جانے لگا کہ کتاب کس انداز میں ترتیب دی جائے۔ابو نے یہاں ایک رائے دی: بجائے اس کے کہ خود بھی لکھو اور دوسرے عزیز و اقارب سے بھی لکھوانے کا جتن کرو، بہتر ہے کہ میری مختلف تحریروں میں آپ لوگوں کی امی کا جو ذکر موجود ہے، اسی کو یک جا کر لو۔میری تحریروں میں ان کا اتنا ذکر کیا گیا ہے کہ آپ لوگ اسی کو مرتب کر کے اپنی ماں کو مزید خوش کر سکتے ہیں۔

یکم مارچ کو یہ ساری باتیں ہوئیں اور ۳ مارچ کو پھوپھی زبیدہ کے جانے کے بعد ہم بھائی، بہنوں نے ابو کی کتابوں کی ورق گردانی شروع کر دی۔امی کے بارے میں، بلکہ سارے خاندان کے بارے میں ابو کی تحریریں ہمارے علم میں ہیں۔چنانچہ تھوڑی تگ و دو کے بعد ابو کی مختلف کتابوں میں سے ان تحریروں کی نشان دہی کر دی گئی۔ابو کی ساری کتابوں کی ان پیج فائلز ان کے پاس محفوظ ہیں۔اس لیے آسانی کے ساتھ سارا مواد جمع کر لیا گیا۔کتابوں سے باہر کا کچھ مواد ابو نے نشان زد بھی کر دیا اور فراہم بھی کر دیا۔

اسلامیہ یونیورسٹی بھاول پور سے ابو پر تحقیقی کام کرنے والی ایک طالبہ منزہ یاسمین نے ایک بار امی کو ایک سوال نامہ بھیجا تھا۔امی نے تب جو، جواب لکھے تھے، وہ منزہ یاسمین کے مقالہ میں بھی شامل ہیں اور کتاب ''انٹریوز'' میں بھی شامل ہیں۔انہیں اس کتاب میں بھی شامل کرلیا ہے۔

ماہنامہ پاکیزہ کراچی کے نومبر ۲۰۰۷ء کے عیدنمبر میں شائستہ زرّیں صاحبہ کا ایک سروے شائع ہوا تھا۔اس میں امی سے بھی سوالات کیے گئے تھے اور امی کے جوابات کو عیدنمبر میں شائع کیا گیا تھا،امی کے جواب بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔اسی دوران امی نے یاد دلایا کہ ماہنامہ پاکیزہ کراچی کے سال ۱۹۹۱ء،مئی یا جون کے شمارہ میں ایک رنگین صفحہ پر ان کی تصویر کے ساتھ کچھ سوال و جواب کا سلسلہ شائع ہوا تھا۔یہ تب کی بات ہے جب امی ایبٹ آباد سے جرمنی کے لیے روانہ ہونے والی تھیں۔اس یادگار شمارہ سے اپنا مطلوبہ مواد حاصل کرنے کے لیے ابو سے کہا۔انہوں نے روز نامہ ایکسپریس کراچی کی معروف کالم نگار،افسانہ نگار اور ناول نگار محترمہ نسیم انجم صاحبہ کو لکھا کہ یہ پرانا میٹر تلاش کرادیں۔انہوں نے ہر ممکنہ کوشش کر دیکھی لیکن لگ بھگ ربع صدی پرانا رسالہ دستیاب نہ ہوسکا۔یوں اُس انٹرویو نما تحریر کو اس کتاب میں شامل نہیں کیا جاسکا۔تاہم اس کتاب کے سرورق پر وہی تصویر دے دی ہے جو تب ماہنامہ پاکیزہ میں شائع ہوئی تھی۔

یہ کتاب جو ہماری امی کے ذکر پر مشتمل ہے۔ہم پانچوں بھائی بہنوں کی جانب سے امی کے ساتھ محبت کے اظہار کی ایک صورت ہے۔

ایک شاعر اور ادیب کی بیوی کی حیثیت سے درحقیقت یہ امی کا کمال ہے کہ ان کے شوہر شاعر اور ادیب نے ان کے بارے اتنا کچھ لکھ دیا ہے کہ ایک چھوٹی سی کتاب بن گئی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ امی نے ساری زندگی ابو کے ہر دکھ سکھ میں ساتھ نبھایا ہے۔اگر ابو کی زندگی کو پورے پس منظر کے ساتھ دیکھیں تو ہمارے سماج نے ان کے ساتھ شدید ناانصافیاں کی ہیں جن کے نتیجہ میں انہوں نے بے شمار دکھ جھیلے ہیں۔امی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہر دکھ میں مکمل طور پر ابو کا ساتھ نبھایا ہے۔زندہ رہنے کے لیے اور ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے کام کرتے رہنے کے لیے ہمیشہ ابو کو حوصلہ دیا ہے۔

پہلا کمال امی کا ہے کہ انہوں نے اپنی محبت اور وفا سے ابو کے دل میں اس حد تک گھر کرلیا کہ وہ اتنی سرشاری کے ساتھ امی کا ذکر کرتے چلے گئے۔دوسرا کمال ابو کا ہے کہ انہوں نے ادبی دنیا کے رائج شدہ طور طریقوں کے برعکس اپنے خاکوں میں،یادوں میں،افسانوں میں،انشائیوں میں،انٹرویوز میں،اور دوسری کتابوں میں امی کا ذکر بڑی محبت سے کیا اور کرتے ہی گئے۔

ایسے ماحول میں جہاں اردو کے شاعر اور ادیب کبھی اپنے سماج کی عکاسی کر رہے ہوتے ہیں یا سماج کی اصلاح کر رہے ہوتے ہیں اور کبھی کائنات بلکہ کون و مکاں کی باتیں کر رہے ہوتے ہیں۔نہیں کرتے تو صرف اپنے بیوی بچوں اور خاندان کا ذکر نہیں کرتے۔افسوس یہ ہے کہ بعض نامور اردو ادیبوں نے اپنی یادوں اور سوانح میں بھی یا تو بیوی کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اگر ذکر کیا ہے تو بہت ہی سرسری سا۔ممکن ہے اس کتاب کی اشاعت کے بعد بعض شاعروں اور ادیبوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا ہو کہ ان کے لفظوں کی دنیا پر ان کی بیوی اور بچوں کا بھی تھوڑا بہت حق ہے۔یہ احساس پیدا ہو گیا تو امید کی جاسکتی ہے کہ چراغ سے چراغ جلتے جائیں گے۔اردو ادب میں دنیا جہان کے موضوعات کے ساتھ بیوی،بچوں اور دیگر عزیز و اقارب کو بھی تھوڑی اہمیت دینے کا صحت مند رویہ پنپنے لگے گا کہ یہ سب بھی اس زندگی اور کائنات کا حصہ ہیں۔

یہ کتاب ہم پانچ بھائی بہنوں کی طرف سے شائع کی جارہی ہے۔میں باقی سب بھائی بہنوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ سب کی برابر کی حصہ داری کے باوجود مجھے یہ عزت دی گئی کہ میں اس کتاب پر اس کے مرتب کی حیثیت سے اپنا نام دے سکوں۔

آج 4/اپریل 2015ء کو امی،ابو کی شادی کے چوالیس (44) سال پورے ہو رہے ہیں۔اور آج ہی یہ کتاب مکمل ہوگئی ہے۔(اب اسے چھپنے کے لیے بھیج رہے ہیں) اس لحاظ سے ہم پانچ بھائی بہنوں کی جانب سے یہ کتاب امی اور ابو دونوں کے لیے شادی کی سال گرہ کا تحفہ ہے۔

شعیب حیدر
Hattersheim,Germany.
E-Mail: shoaib.h@hotmail.de

خاکہ

پسلی کی ٹیڑھ

(مبارکہ)

پھول تھا وہ تو میں خوشبو بن کے اس میں جذب تھا
وہ بنا خوشبو تو میں بادِ صبا ہوتا گیا

بیوی۔۔بالخصوص زندہ بیوی کا خاکہ لکھنا اپنی خیریت کو داؤ پر لگانے اور شیر بلکہ شیرنی کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ بہر حال میں اقرار کرتا ہوں کہ جو کچھ لکھوں گا سچ سچ لکھوں گا۔سچ کے سوا کچھ نہ لکھوں گا۔اللہ میری حفاظت فرمائے۔(آمین)

مبارکہ میری ماموں زاد ہے۔ میں غالباً چھ سال کا تھا، مبارکہ دو سال کی تھی۔ ہمارے بیشتر رشتہ دار ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔کسی تقریب کے باعث اور بہت سارے عزیز بھی جمع تھے۔ بڑی ممانی نے لاڈ سے پوچھا فلاں سے شادی کروگے؟ میں نے صاف انکار کر دیا۔ پھر پوچھا گیا کس سے شادی کروگے؟۔۔میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ مبارکہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اس کے ساتھ کروں گا۔شاید بڑی ممانی کو میری پسند پر کوئی اعتراض تھا یا اپنی تجویز رد کئے جانے کا افسوس،فوراً بولیں:''ہم ریاستیوں (سرائیکیوں) کو ایک رشتہ دے کر ہی بھولے ہیں۔اور کسی ریاستی کو اب رشتہ نہیں دینا''۔۔اس کا جواب مجھے اپنی یادداشت میں کہیں نہیں ملتا البتہ خاندان میں بڑی مستحکم روایت موجود ہے کہ میں نے جواباً کہا تھا: اگر آپ مبارکہ سے شادی نہیں کروگے تو جب یہ روٹیاں پکا رہی ہوگی جیپ لے کر آؤں گا اور اسے اس میں بٹھا کر لے جاؤں

گا۔۔ماموں ناصر جو پاس ہی بیٹھے تھے، میرا جواب سن کر بڑی ملائمت سے بولے: بیٹا! تم شرافت سے آنا میں خود ہی تمہیں بیٹی دے دوں گا۔

بچپن میں غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر کہی ہوئی مذاق کی ایک بات اتنی سنجیدگی اختیار کر گئی کہ اب وہ سارا مذاق وجدانی معلوم ہوتا ہے۔ممانی مجیدہ فوت ہوگئیں تو ماموں ناصر کے لئے بچوں کو سنبھالنا مسئلہ بن گیا۔انہوں نے اپنے بیان کے مطابق خود ہی رشتے کا انتظام کر دیا۔یعنی اس زبانی مذاق کے ٹھیک بارہ سال بعد ہمارے ساتھ عملی مذاق ہوگیا۔ میں اٹھارہ سال کا تھا، مبارکہ چودہ سال کی تھی جب ہماری شادی ہوگئی۔ ہماری شادی کیا تھی گڈی،گڈے کا بیاہ تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہ اسے کچھ خبر! بے خبری کے عالم میں ولیمہ بھی ہوگیا۔کئی دن گزر گئے اور ہم بے خبری کی جنت میں سوتے رہے۔پھر یکا یک،از خود آگہی کا کوندا لپکا۔اور پھر ہم پتوں سے اپنے تن ڈھانپنے لگے۔آدم اور حوا کی کہانی آگے بڑھنے لگی۔

بچپن کے اس واقعہ کے حوالے سے میں نے ایک دفعہ مبارکہ سے کہا: بچپن کی معمولی غلطی کی کتنی بڑی سزا ملی ہے۔۔اس نے فوراً کہا: غلطی آپ کی تھی، سزا میں بھگت رہی ہوں۔۔خیر بات ہو رہی تھی آدم اور حوا کی کہانی کی۔اس کہانی میں اتوار کے دن کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ میں اتوار کے دن پیدا ہوا، مبارکہ بھی اتوار کے دن پیدا ہوئی، ہمارا نکاح بھی اتوار کے دن ہوا۔پہلی بیٹی رضوانہ اتوار کے دن پیدا ہوئی۔ پہلا بیٹا شعیب اتوار کے دن پیدا ہوا۔آخر حکومت پاکستان نے تنگ آکر اتوار کی سرکاری چھٹی ختم کر دی اور چھٹی کے لئے جمعہ کا دن مقرر کر دیا۔

لڑکپن کے دو سال ہم نے اکٹھے گزارے تھے۔ پتہ نہیں یہ بچپن کی نامزدگی اور لڑکپن کی انڈرسٹینڈنگ تھی یا کچھ اور۔۔ہم دونوں ایک دوسرے کے مزاج شناس بن گئے۔ پھر بات مزاج شناسی سے بڑھ کر محبت اور دوستی کی سطح تک پہنچی اور وہاں سے بھی آگے بڑھی تو اس مقام کے بیان کے لئے کوئی لفظ نہیں ملا۔ بیوی، دوستی اور محبت۔۔یہ سارے مقدس رشتے اب مبارکہ کے سامنے چھوٹے پڑ گئے ہیں۔(خدا کرے مبارکہ پر اس جملے کا کچھ اثر ہو)

میں نے کتابی سلسلہ ''جدید ادب'' جاری کیا۔اس میں مبارکہ کی تمناؤں کا لہو شامل تھا۔ ہر

شمارے کے ساتھ اس کا ایک آدھ زیور بک جاتا۔ اس اللہ کی بندی نے ایک دفعہ بھی تکرار نہیں کی۔ جب تک اس کا زیور ساتھ دیتا رہا ''جدید ادب'' جاری رہا۔ زیور ختم ہوگئے تو ''جدید ادب'' بھی بند ہوگیا۔ اب سوچتا ہوں میں نے اس کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ لیکن مبارکہ نے بھی تو میرے ساتھ ظلم کیا ہے۔ میرے اچھے برے ہر طرح کے کاموں میں ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ کسی نازک موڑ پر آ کر اگر ساتھ دینا ممکن نہیں رہا تو اس نے کنارے پر کھڑے ہو کر نظارہ کیا مگر مجھے دباؤ ڈال کر روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے اس طرزِ عمل نے میری عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ میری ''گمراہیاں'' اسے معلوم ہیں میرے ''گناہ'' اس کے علم میں ہیں لیکن مجال ہے اس نے کبھی مجھے شرمندگی کا ہلکا سا احساس بھی دلایا ہو۔

امی جی اور مبارکہ میں گہری انڈرسٹینڈنگ تھی۔ ساس بہو میں کبھی کبھی بدمزگی بھی ہوتی مگر ایسی نہیں جس میں ابا جی کو یا مجھے مداخلت کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ جلد ہی ساس، بہو کی جگہ پھوپھی، بھتیجی آگے آ جاتیں اور خود ہی سارا معاملہ سنبھال لیتیں۔ آخر دم تک امی جی اور مبارکہ ایک ساتھ رہیں، صرف ایک سال کا عرصہ دونوں کو الگ رہنا پڑا کیونکہ خانپور چھوڑ کر ابا جی اور امی جی نے بالائی پنجاب میں سکونت اختیار کر لی تھی اور ملازمت کے باعث ہم شوگر ملز کی کالونی میں شفٹ ہو گئے تھے۔ اس ایک سال کے عرصہ میں بھی مبارکہ، امی جی سے ملنے کے لئے دو دفعہ گئی۔۔ اسی دوران ابا جی وفات پا گئے۔ شدید صدمے کا اثر زائل ہونے لگا تو سارے عزیز اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹنے لگے۔ اکبر اور طاہر بھی امی جی سے اجازت لئے بغیر اپنی بیگمات کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ جاتے جاتے امی سے اتنا کہہ گئے کہ عدت پوری کر کے ہمارے ہاں آ جایئے گا۔ مبارکہ جانتی تھی کہ امی جی اس طرح تو کسی بیٹے کے پاس بھی نہیں جائیں گی۔ اس نے مجھے الگ کر کے سارے صورتحال سے آگاہ کر کے کہا میں ایسی حالت میں پھوپھی کو اکیلے نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ جا کر بچوں کے سکول چھوڑنے کے سٹرفکیٹ بھجوا دیں۔ میں اب پھوپھی کے پاس ہی رہوں گی۔ چنانچہ پھر مبارکہ اور بچے امی جی کے پاس ہی رک گئے۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ میاں بیوی میں محبت بہت زیادہ ہو تو دونوں کی شباہت یکساں

ہو جاتی ہے۔ فیض اور ایلس کی تصویریں دیکھ کر یہ بات سچ معلوم ہونے لگتی ہے۔ میرا خیال ہے میری اور مبارکہ کی شکلوں میں بھی کچھ ایسا تغیر رونما ہو رہا ہے۔ ''من تو شدم تو من شدی'' کی حد تک تو محبت ٹھیک تھی لیکن جب اس مقام سے آگے بڑھی تو پھر دونوں کی شکلیں بگڑنے لگیں اور بگڑتے بگڑتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ''تم رہے نہ تم ہم رہے نہ ہم''۔۔۔۔۔۔ اچھی بھلی شکلیں بگڑ گئیں مگر ہماری محبت کی شدت تو ثابت ہوگئی۔

میں اپنی فکری آزادہ روی کے باعث مبارکہ کے لئے بہت تکلیف کے سامان پیدا کر بیٹھا۔ مذہبی تعصّب رکھنے والے عزیزوں نے طوفان اٹھا لیا۔ مبارکہ دوہرے عذاب میں تھی۔ اپنی سوسائٹی کو چھوڑنا بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا اور مجھ سے علیحدگی کا بھی وہ سوچ نہیں سکتی تھی۔ میرا خیال ہے انسان کی مظلومیت بجائے خود ایک طرح کا مقام ولایت ہے۔ مبارکہ مظلومیت کی حالت میں تھی۔ محلے کی ایک پردھان عورت نے کہا: مبارکہ کو حیدر سے طلاق لے لینی چاہیئے۔۔ چند ماہ کے اندر اسی عورت کی اپنی نو بیاہتا لیڈی ڈاکٹر بیٹی کو طلاق ہوگئی۔ ہمارے ایک ''بزرگ'' نے امریکہ سے دباؤ ڈالا اور میرے ساتھ مبارکہ کے سماجی بائیکاٹ کا حکم صادر کر دیا۔ حکم نامے کے ایک ماہ کے اندر ان کے اپنے خاندان میں بیٹے بہو میں پھوٹ پڑ گئی جو بالآخر دونوں میں علیحدگی پر منتج ہوئی۔ اسے مکافاتِ عمل کہیئے۔ نظامِ فطرت کہیئے یا مظلوم پر جبر کا انجام۔ رہے نام اللہ کا!

مبارکہ صاف دل اور صاف گو عورت ہے۔ محبتی بیوی اور بے تکلف ماں ہے۔ رضوانہ کو دیکھ کر عام طور پر ناواقف خواتین یہی سمجھتی ہیں کہ مبارکہ کی چھوٹی بہن یا نند ہوگی مگر جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کی بڑی بیٹی ہے تو حیران ہوتی ہیں۔ ماں بیٹی میں صرف ساڑھے سولہ سال کا فرق ہے جبکہ میرے سب سے چھوٹے بھائی اعجاز اور میری عمر میں انیس سال کا فرق ہے۔ (پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے)۔ اپنے پانچوں بچوں رضوانہ، شعیب، عثمان، طارق اور درِ ثمین کے ساتھ مبارکہ نے دوستی کر رکھی ہے۔ ماں والی دھونس نہیں جماتی البتہ دوستانہ دھونس ضرور جما لیتی ہے۔

کسی کی شادی ہو۔۔ مبارکہ شادی بیاہ کی تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ جب

لڑکی کی رخصتی کا وقت آتا ہے دلہن سے زیادہ اس کے آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔میں اس کی اس رقیق القلبی سے خاصا تنگ تھا۔خدا بھلا کرے ماموں سمیع کی بڑی بیٹی نوشی کا۔۔نوشی کی رخصتی ہونے لگی تو ممانی راشدہ پرسکون تھیں۔چھوٹی بہنیں مطمئن۔مگر ان کی کزن مبارکہ بیگم حسب معمول رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔اتفاق سے میری نظر نوشی کی طرف اٹھ گئی۔دولہا کے ساتھ گھر سے باہر آتے ہوئے بی بی مسکرا رہی تھی۔۔گاڑیاں رخصت ہوتے ہی میں نے مبارکہ بیگم کو پکڑ لیا۔یہ کیا شرافت ہے۔جس کی شادی ہے وہ مسکرا رہی ہے۔اس کی ماں بہنوں کے چہروں پر اطمینان ہے اور آنجناب رو رو کر ہلکان ہو رہی ہیں۔اللہ اس کا بھلا کرے کہ تب سے اس نے شادی بیاہوں پر رونے دھونے کا سلسلہ فی الحال ترک کر دیا ہے۔(فی الحال اس لئے کہ اپنی بیٹیوں کی شادی پر وہ ساری کسر نکالے گی ☆)

مبارکہ کو مشرقی پنجاب سے غائبانہ انسیت ہے۔اس کی ظاہر وجہ تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے کئی برس بعد ممانی مجیدہ ہندوستان گئیں تو وہیں مبارکہ کی پیدائش ہوگئی۔ممانی مجیدہ سے ہی اسے معلوم ہوا کہ اس کی زچگی کرانے والی خاتون کا نام پیاری دیوی تھا۔سو اسے مشرقی پنجاب سے بھی ایک لگاؤ ہے اور ''پیاری دیوی'' نام بھی بہت پیارا لگتا ہے۔اس انسیت کی بعض لاشعوری وجوہات بھی ہوسکتی ہیں۔مثلاً مبارکہ کے ددھیال،ننھیال سب مشرقی پنجاب سے پاکستان آئے تھے اور کئی جانوں کا نذرانہ دے کر پاکستان پہنچ پائے تھے۔ہوسکتا ہے آباؤ اجداد کی سرزمین سے اسے لاشعوری طور پر محبت ہو۔پھر مبارکہ ذات کے لحاظ سے باجوہ جٹ ہے جو پنجابی جٹوں کی ایک اعلیٰ ذات ہے۔پانچویں چھٹی پشت سے یہ لوگ سکھ تھے۔اب جو مشرقی پنجاب میں سکھوں کی تحریک چل رہی ہے ممکن ہے مبارکہ کے اندر کی چھپی ہوئی سکھنی کو مشرقی پنجاب کی موجودہ حالت کے باعث بھی اس علاقے سے انسیت محسوس ہوتی ہو۔۱۹۸۷ء میں ہم بھارت گئے تو مبارکہ کی شدید خواہش تھی کہ مشرقی پنجاب کے علاقے دیکھے جائیں مگر دہلی میں بعض دوستوں نے سمجھایا کہ وہاں کے حالات بے حد خراب ہیں۔ایک دوست نے کہا ویزہ میں کل لگوا دیتا ہوں مگر آپ لوگوں کو ادھر جانے نہیں دوں گا۔دراصل انہیں دنوں میں پنجاب میں ایک بس روک کر اس کے تمام مسافروں کو

بغیر کسی تخصیص کے ہلاک کر دیا گیا تھا۔اسی وجہ سے دلی کے دوستوں نے ہمیں مشرقی پنجاب نہیں جانے دیا اور اس علاقے کو دیکھنے کی مبارکہ کی آرزو پوری نہ ہوسکی۔

میری شاعری کو اس کے پورے پس منظر کے ساتھ جاننے والی واحد قاری مبارکہ ہے۔ اسے علم ہے کہ میری کون سی غزل یا نظم کب کہی گئی اور کیوں کہی گئی۔۔اسے یہ بھی علم ہے کہ میں کس کس کو یہ باور کرا چکا ہوں کہ فلاں غزل درحقیقت آپ کے لئے کہی گئی اور یہ بھی علم ہے کہ اصلاً کس کے لئے کہی گئی۔میری شاعری سے باہر کے اس سارے کھیل تماشے کو مبارکہ نے مزے لے کر دیکھا ہے۔میری دوستوں سے اس نے کبھی خار نہیں کھائی،الٹا محبت کی۔

ایک دفعہ میری ایک بہت اچھی دوست نے مبارکہ کی موجودگی میں بتایا کہ ہاتھ کی لکیریں دیکھنے والے ایک ماہر نے بتایا ہے کہ تمہاری شادی کسی میرڈ Married سے ہوگی۔کوئی اور شاعر ہوتا تو اس کی بیوی نے جو طوفان اٹھایا ہوتا اس کی لہریں اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں تک پہنچتیں مگر مبارکہ نے زوردار قہقہے میں ساری بات اڑا دی۔ایک دفعہ بعض عزیزوں نے اسے سمجھایا کہ مرد کا اتنا اعتبار کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا (گویا تھوڑا بہت شک کرتے رہنا چاہیے) مگر مبارکہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔جھلا کر ایک عزیز نے یہاں تک کہہ دیا:اب تمہاری آنکھیں اسی وقت کھلیں گی جب وہ بچوں سے بھرا ٹوکرا لے کر گھر آئے گا۔کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے مبارکہ کے اندر وہی دو سال کی بچی بیٹھی ہے جسے دیکھ کر میں نے کہا تھا اسی کے ساتھ شادی کروں گا۔معصوم،بھالی بھالی ایسے کبوتر (بلکہ کبوتری) کی طرح جو بلّی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لے اور خود کو محفوظ سمجھ لے۔مگر نہیں۔۔ مبارکہ نے تو آنکھیں بھی ہمیشہ کھلی رکھی ہیں اور بلیوں کو دیکھ کر بھی خود کو محفوظ سمجھتی رہی ہے۔ قدرت خدا کی۔ہر خطرے سے محفوظ بھی گزر جاتی رہی ہے۔ہر چند اس میں خدا کی قدرت کے ساتھ میری شرافت کا بھی دخل ہے۔

ایک دفعہ میں نے مبارکہ سے پوچھا:تمہیں مجھ پر اتنا اعتماد کیوں ہے؟

''اعتماد''؟۔۔مبارکہ نے حیرت سے کہا اور پھر رواں ہوگئی ''تمہارے ساتھ شادی کون کرے گی؟ کس کا دماغ خراب ہے؟شکر کرو کہ میں مل گئی ہوں اور وہ بھی اس لئے کہ تمہارے ماموں کی بیٹی

ہوں“

ان جملوں سے ہمارے درمیان پائی جانے والی (یک طرفہ) بے تکلفی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ مبارکہ کے بارے میں لکھنے کی جرأت نہیں۔اس خاکے کا دوسرا حصہ مبارکہ کی وفات کے بعد لکھوں گا یا میری وفات کے بعد وہ لکھے گی۔

☆☆☆

☆ رضوانہ کی شادی پر ساری کسر نکال دی ہے۔جزاک اللہ

یہ خاکہ ابو کے خاکوں کے مجموعہ میری محبتیں سے لیا گیا ہے

دوسرے خاکوں، یادوں اور انشائیے میں ذکر

ماموں ناصر کے ساتھ میری محبت دراصل ”بچپن کی محبت“ ہے میں نے ابتدائی عمر میں ہی دیکھا کہ ماموں ناصر کو اپنی بہنوں میں میری امی جی سے خاص محبت تھی۔اتنی خاص کہ دوسری بہنوں کے لئے بھی بعض اوقات غصے کا موجب بن جاتی۔ بے جی (نانی جان) بھی کبھی کبھی جھلا جاتیں۔امی جی کے تعلق سے یہ محبت ابا جی تک بھی پہنچی ماموں ناصر ابا جی کا بے حد احترام کرتے۔رحیم یار خان میں تنگی کے دنوں میں جب بھی ماموں ناصر سے قرض مانگا انہوں نے فوراً فراہم کیا، چاہے خود بھی کہیں سے قرض ہی کیوں نہ لیا ہو لیکن ابا جی کے کام میں تاخیر نہیں ہونے دی۔۔ایک موقعہ پر بہت سارے عزیز واقارب جمع تھے۔ابا جی اپنے جوتوں کی مرمت اور پالش کرانے کے لئے کسی بچے کو ڈھونڈ رہے تھے۔ جب تک کوئی بچہ ملتا ماموں ناصر بتائے بنا خود ابا جی کے جوتے لے کر چلے گئے اور مرمت کرا کے، پالش کرا کے لے آئے۔۔امی جی اور ابا جی کے ساتھ ماموں ناصر کے ایسے محبتی رویّے کی متعدد مثالیں ہیں۔اسی وجہ سے بچپن میں ہی مجھے ماموں ناصر سے محبت ہوگئی۔مبارکہ کے ساتھ میری شادی ہونے میں میری پسند کے علاوہ امی جی اور ماموں ناصر کی گہری محبت کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔

خاکہ ”رانجھے کے ماموں“ سے اقتباس

مرحومہ ممانی مجیدہ سے ماموں ناصر کے چار بچے ہیں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔۔مُبارکہ، وحیدہ،غزالہ☆ ،مُبشّر احمد خالد۔۔ممانی آصفہ سے دو بیٹیاں ہیں۔۔عائشہ،بُشریٰ۔۔ممانی مجیدہ کی ساری اولاد شادی شدہ ہے بڑی بیٹی مبارکہ میری بیوی ہے۔اس سے چھوٹی وحیدہ کے شوہر بشیر احمد شاہد عمر میں مجھ سے چھ ماہ بڑے ہیں اور سب سے چھوٹی غزالہ کے شوہر محمود عمر میں مجھ سے

دوسال بڑے ہیں۔یوں میں رشتہ کے لحاظ سے اس طرح ماموں ناصر کا سب سے بڑا داماد ہوں کہ ان کی بڑی بیٹی کا شوہر ہوں اور اس لحاظ سے اب تک کا سب سے چھوٹا داماد ہوں کہ دونوں چھوٹے داماد عمر میں مجھ سے بڑے ہیں

؎ ایں سعادت بزور بازو نیست

خاکہ ''رانجھے کے ماموں'' سے اقتباس

پہلی محبت سے یاد آیا کہ میری پہلی محبت بھی میری امی جی ہیں اور آخری محبت بھی امی جی ہیں۔اس اوّل اور آخر کے بیچ میں بہت سی محبتیں آئیں مگر درحقیقت وہ سب میری پہلی اور آخری محبت کا عکس تھیں۔امی جی کا چہرہ کتابی اور گول چہرے کے بین بین تھا۔چنانچہ بیچ میں آنے والی میری ساری محبتیں بھی کتابی چہرے والی تھیں۔اپنی بیوی سے میری گہری دوستی کی وجہ شاید یہی ہے کہ امی جی کی بھتیجی ہونے کے ساتھ امی جی سے کافی مشابہت بھی رکھتی ہے۔ماہرین نفسیات اس کی جو چاہیں توجیہہ کرلیں، مجھے اعترافِ جرم سے عار نہیں۔

خاکہ ''مائے نی میں کنوں آکھاں'' سے اقتباس

جرمنی پہنچنے کے بعد بچپن میں امّی جی سے سنی ہوئی کئی کہانیاں یاد آئیں۔مبارکہ جس کی سادگی کا میں پاکستان میں مذاق اڑایا کرتا تھا' جرمنی میں اب اس کے سامنے میں ایک پاکستانی ''پینڈو'' تھا۔ مبارکہ بچوں سمیت مجھ سے اڑھائی سال پہلے جرمنی میں آچکی تھی اس لئے یہ ملک اس کے لئے اجنبی نہیں رہا تھا جبکہ میں ''کثرتِ نظّارہ'' سے ایسے رُک رُک جاتا تھا جیسے شہر کے چوراہے پر ''گواچی گاں'' کھڑی ہوتی ہے۔پہلی بار ایک مارکیٹ میں داخل ہونا تھا۔میں دروازے کے قریب پہنچا تو آٹومیٹک دروازہ اپنے آپ کھل گیا اور میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔امی جی سے سنی ہوئی ''علی بابا اور چالیس چور'' والی کہانی یاد آگئی۔اُس کہانی میں ''کھل جا سم سم'' کہنے

سے دروازہ کھلتا تھا۔یہاں تو مجھے ''کھل جا سم سم'' کہنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔زمین دوز ریلوے اسٹیشنوں میں' مارکیٹوں میں' اُوپر نیچے آنے جانے کے لئے خودکار سیڑھیاں لگی ہوئی ہیں۔میں نے پہلی بار جھجک کے ساتھ بجلی کی سیڑھی پر قدم رکھا' ہلکا سا چکر آیا۔میں نے لحظہ بھر کے لئے آنکھیں موندلیں' جیسے ہی آنکھیں کھولیں' اُوپر کی منزل پر پہنچ چکا تھا۔کسی اناڑی کی طرح سیڑھی کی حد سے باہر آیا تو امی جی کی سنائی ہوئی کئی کہانیاں یاد آنے لگیں۔کہیں کوئی نیک دل دیو ہے' کہیں سبز پری اور کہیں کوئی درویش ہے جو مہم جُو شہزادے کو کسی لمبی مسافت کی کوفت سے بچانے کے لئے' اس کی مدد کرتے ہوئے اُسے آنکھیں مُوندنے کے لئے کہتے ہیں' پھر جب شہزادہ آنکھیں کھولتا ہے تو منزلِ مقصود پر پہنچا ہوتا ہے۔میں اُوپری منزل پر پہنچا تو میرے ساتھ نہ کوئی نیک دل دیو تھا' نہ کوئی درویش اور نہ ہی کوئی سبز پری۔۔۔۔صرف مبارکہ میرے ساتھ تھی۔اس نے اگر سبز سوٹ پہنا بھی ہوا تھا تو وہ اس کے برقعہ کے کوٹ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔اس کے باوجود میں نے مبارکہ کو من ہی من میں سبز پری سمجھا اور خود کو شہزادہ گلفام سمجھ کر خوش ہولیا۔

یہاں کے گھروں میں کھڑکیوں کا شیشہ ایسا ہے کہ آپ اندر بیٹھے ہوئے باہر کی ہر چیز کو دیکھ سکتے ہیں جبکہ باہر کھڑا ہوا کوئی آدمی آپ کو بالکل نہیں دیکھ سکتا۔جب مجھے پہلے پہل اس کا علم ہوا دھیان فوراً سلیمانی ٹوپی والی کہانی کی طرف چلا گیا۔مجھے ایسے لگنے لگا جیسے میں امی جی کی سُنائی ہوئی ڈھیر ساری کہانیوں کا جیتا جاگتا کردار بن گیا ہوں۔ساری کہانیاں جیسے اپنے آپ کو میرے وجود میں دُہرانے لگی ہیں۔کاش! امی جی زندہ ہوتیں اور میں انہیں اُن کی سنائی ہوئی کہانیوں کا حقیقی رُوپ دکھا سکتا۔اب تو وہ خود ہی کہانی بن گئی ہیں۔

اپنے ہاں تو غالبؔ اُس چار گرہ کپڑے کا افسوس کرتے رہے جس کی قسمت میں عاشق کا گریباں ہونا لکھا ہوتا ہے۔اِدھر مغرب میں اُس تین گرہ کپڑے کی قسمت پر رشک آتا ہے جو گرمیوں میں حسینانِ مغرب نے زیبِ تن کر رکھا ہوتا ہے۔ایک طرف ایسا توبہ شکن منظر ہوتا ہے' دوسری طرف برقعہ میں لپٹی لپٹائی مبارکہ بیگم۔۔۔۔۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا ہے' پردہ کا

مطلب خود کو دوسروں کی نظروں سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔ پاکستان میں تو چلو ٹھیک ہے لیکن یہاں جرمنی میں اس قسم کا برقعہ تو پردے کے تقاضے پورے کرنے کی بجائے ہر کسی کو متجسّس کر دیتا ہے کہ یہ کیا شے جا رہی ہے؟ میں نے دو تین دفعہ اسے تجربہ کرایا کہ عام آنے جانے والی گوریوں کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا لیکن مبارکہ کے بھاری بھر کم پردے کی وجہ سے ہر گزرنے والا ہمیں تعجب سے دیکھتا ہے اور ضرور دیکھتا ہے۔ یوں مبارکہ کی بے پردگی ہو نہ ہو میری اچھی خاصی بے پردگی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس پر میری کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔

"کھٹی میٹھی یادیں"۔باب: بزمِ جاں سے اقتباس

میرے ہاتھ پر قسمت کی لکیر، دماغ کی لکیر سے ٹکرا کر رُک گئی ہے۔ میں جب کسی بات پر اَڑ گیا تو بڑے سے بڑے فائدے کو بھی نظر انداز کر دیا اور یوں کئی بار اپنا نقصان کیا۔ دوسری طرف میری بیوی مبارکہ کے ہاتھ پر قسمت کی لکیر بہت واضح، صاف اور روشن ہے۔ سو میری خوش قسمتی دراصل میری بیوی کی مرہونِ منّت ہے۔

"کھٹی میٹھی یادیں"۔باب: دعائیں اور قسمت، سے اقتباس

یہاں جرمنی میں ایک بار مجھے صوفیانہ خیالات نے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ زندگی کی ہر سرگرمی بے معنی لگ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کسی ویرانے میں جا کر اللہ اللہ کرتے ہوئے زندگی بسر کروں۔ پھر زندگی ہی بے معنی لگنے لگی۔ میں نے دنیا کی بے ثباتی پر گفتگو شروع کر دی۔ گفتگو گہری اور طویل ہونے لگی تو مبارکہ نے کہا "ٹھہریں! میں آپ کی شوگر چیک کرتی ہوں"۔۔۔۔ جب شوگر چیک کی گئی تو اس کا لیول معمول سے خاصا زیادہ تھا۔ شوگر کنٹرول کرنے والی دوا لینے سے حالت بہتر ہوئی تو زندگی بامعنی اور خوشی سے بھری ہوئی لگنے لگی۔ تب میں نے شریر انداز سے مبارکہ سے کہا "پہلے زمانے میں شوگر کی بیماری کی تشخیص کرنے، اسے ماپنے اور کنٹرول کرنے کا کچھ پتہ نہ تھا۔ شاید اسی وجہ سے بعض شہزادے اپنے محل چھوڑ کر جنگلوں میں چلے گئے۔ بُرا

ہوا ان جدید سہولیات کا جن کے باعث میں گوتم بُدھ بنتے بنتے رہ گیا"

"کھٹی میٹھی یادیں"۔باب: شوخیاں، بچپنا سے اقتباس

میری بیوی کا خیال ہے کہ میں انتہا پسند ہوں۔ یا تو اتنا میٹھا بن جاؤں گا کہ دوسرا مجھے محبت ہی میں کھا جائے۔ اور یا اتنا کڑوا ہو جاؤں گا کہ کسی کے حلق سے ہی نہیں اتروں گا۔ مجھے اپنی اس کمزوری کا ادراک ہے۔ میں خود کو بدلنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن جو عیب قدرتی طور پر ودیعت کیا گیا ہو وہ ختم نہیں ہوسکتا۔

"کھٹی میٹھی یادیں"۔باب: علّتیں، علالتیں سے اقتباس

جرمنی میں نیشنلٹی لینے کے لئے پہلے اتنی شرائط تھیں کہ بندے کو جرمنی میں رہتے ہوئے سات آٹھ سال ہو گئے ہوں، اپنے ذرائع آمدن ہوں یعنی حکومت سے اسے کوئی امداد نہ ملتی ہو اور جرمن زبان مناسب حد تک آتی ہو۔ امریکہ کے ٹریڈ ٹاورز پر حملوں یعنی نائن الیون کے بعد سے پورے یورپ میں بھی رویوں میں قدرے سختی آ گئی ہے۔ میرے سارے بچوں کو جرمن نیشنلٹی مل چکی تھی۔ میرا اور میری اہلیہ کا معاملہ یوں ہے کہ ہمیں جرمن زبان بالکل نہیں آتی۔ میری ملازمت کی آمدنی اتنی کم ہے کہ حکومت کو اپنے فلاحی قوانین کے مطابق مجھے ہر مہینے میری ضرورت کی بقیہ رقم دینا ہوتی ہے۔ گویا ہمیں زبان بھی نہیں آتی تھی اور ہماری آمدنی بھی اپنے لئے پوری نہ تھی۔ اس لئے ہم دونوں شرائط پر پورے نہیں اترتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے نیشنلٹی کے حصول والے اپنے فارم پُر کروا کر پانچ سال تک اپنے پاس ہی رکھ چھوڑے تھے۔ چونکہ اپنی لیگل پوزیشن کا اندازہ تھا اس لئے اپلائی کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ آخر پانچ سال کے بعد میں نے کچھ ہمت کی اور مبارکہ سے کہا کہ اپلائی تو کر دیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ درخواست مسترد ہو جائے گی۔ خیر ہے، ایک تجربہ تو ہو جائے گا۔ سو، جی کڑا کر کے ہم نے درخواست جمع کرا دی۔ روٹین کے مطابق ہمیں جرمن زبان کے ٹیسٹ کے لئے بلاوا آ گیا۔ جس دن ٹیسٹ تھا اس

دن میں نے علی الصبح انٹرنیٹ پر یاہو کے قسمت کے حال والے حصہ کو دیکھا تو وہاں کچھ اس مفہوم میں واضح احوال لکھا ہوا تھا کہ آپ آج جس خاص کام کے لئے جا رہے ہیں، اس میں کامیابی نہیں ہو گی لیکن ہمت نہ ہاریں اور کوشش جاری رکھیں۔ یہ پڑھ کر میں دل میں ہی ہمت ہار بیٹھا۔ مبارکہ بیدار ہوئی تو اس نے ایک انوکھا سا خواب سنایا۔ اس کی کوئی جاننے والی باجی کوثر ہیں، انہوں نے ہم دونوں کو اپنے گھر پر دعوت دی ہوئی ہے اور ہم باجی کوثر کی دعوت کھا رہے ہیں۔ اس خواب سے کچھ امید بندھتی نظر آئی تو میں نے گومگو کی حالت میں مبارکہ کو اپنا آزمودہ ایک ٹوٹکا بھی بتا دیا۔ جب زبان کا ٹیسٹ لینے والی کے کمرے میں جانے لگیں تو اپنی انگلی سے اپنی پیشانی پر **یاعزیز!** لکھ لیں۔ افسر کا رعب دل پر نہیں رہے گا اور افسر کے دل میں آپ کے لئے نرمی پیدا ہو جائے گی۔

پہلے مجھے ٹیسٹ کے لئے بلایا گیا، ایک اخباری تراشہ کی ریڈنگ کرائی گئی پھر اُس پر گفتگو کی گئی۔ مجھے آج تک علم نہیں ہے کہ میں نے کیا پڑھا تھا اور کیا ڈسکس کی تھی۔ لیکن مجھے بتایا گیا کہ میں امتحان میں پاس ہو گیا ہوں۔ میرے بعد مبارکہ گئی اور وہ بھی اسی طرح پاس قرار دے دی گئی۔ میری جرمن زبان اتنی خراب ہے آج بھی کسی ٹیسٹ میں بٹھایا جائے تو فیل ہو جاؤں گا لیکن اللہ کا کرم تھا کہ ہم دونوں کو زبان کے ٹیسٹ میں بھی پاس قرار دے دیا گیا اور آمدن پوری نہ ہونے کی خامی کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے اخبارات و رسائل میں اور انٹرنیٹ پر قسمت کے احوال بتانے والے حصے دیکھنا ترک کر دیئے ہیں۔ البتہ جس خاتون نے ہمارا جرمن زبان کا ٹیسٹ لے کر ہمیں پاس قرار دے دیا تھا اس کے لئے کبھی کبھار دعا ضرور کر لیتا ہوں اللہ اسے خوش رکھے! ہمیں نیشنلٹی ملنے کے معاً بعد سے اب یہاں اس کے حصول کا طریق کار پہلے سے بھی بہت زیادہ مشکل کر دیا گیا ہے۔

''کھٹی میٹھی یادیں''۔ باب: روح اور جسم سے اقتباس

کبھی کبھار تھوڑا سا وقت ملتا ہے اور گانے سننے کا موڈ ہوتا ہے تو کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے

کوئی سی ڈی لگا لیتا ہوں۔ ایک بار صبح سویرے کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے میں نے لتا منگیشکر کا ایک گانا لگایا ''یہ شام کی تنہائیاں، ایسے میں تیرا غم''۔۔۔ مبارکہ کمرے کے آگے سے گزری تو کہنے لگی یہ کیا صبح صبح ''شام کی تنہائیاں۔۔۔'' لگا کر بیٹھے ہیں۔ میرے پسندیدہ گانوں پر مبارکہ کے تبصرے بعض اوقات اپنا الگ لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ پنجابی کا ایک پرانا گانا سنتے ہوئے مبارکہ نے میری کیفیت پر بڑا مزے کا تبصرہ کیا تھا۔ میں وہ احوال ڈاکٹر نذر خلیق کے نام اپنے ایک خط میں لکھ چکا ہوں، جسے انہوں نے اپنی مرتب کردہ کتاب میں شامل کر دیا تھا۔ خط کا وہ حصہ بنیادی طور پر یادوں سے تعلق رکھتا ہے اور اب یہاں گانوں کا ذکر ہو رہا ہے تو اپنے ۱۶؍نومبر ۲۰۰۲ء کے تحریر کردہ اس خط کا متعلقہ حصہ یہاں درج کئے دیتا ہوں:

''ایک دن میں پنجابی کی ایک ویب سائٹ ''اپنا آرگ ڈاٹ کام'' سے طفیل ہوشیار پوری صاحب کا مشہور گانا ''چٹھی میری ڈھول نوں پچائیں وے کبوترا'' سنتے ہوئے دوستوں کی ای میلز کے جواب دے رہا تھا۔ گانے سے اپنی بعض یادوں کے باعث میں کچھ جذباتی سا بھی ہو رہا تھا۔ اسی دوران کمرے میں مبارکہ آ گئی اور ہنسنے لگ گئی۔۔۔۔۔ میں نے حیران ہو کے پوچھا کیا ہوا ہے؟

کہنے لگی انٹرنیٹ پر ای میلز کے جواب لکھ رہے ہیں اور ساتھ ''چٹھی میری ڈھول نوں پچائیں وے کبوترا'' سن کر جذباتی ہو رہے ہیں۔

مبارکہ کی بات سن کر میں اپنی جذباتی کیفیت ہی میں مسکرا دیا۔

لیکن بعد میں غور کیا تو مجھے کبوتروں کے ذریعے پیغام بھیجنے والے دَور سے ای میل کے ذریعے پیغام بھیجنے والے دَور تک کے سارے زمانے اپنے اندر برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ نیا دور اپنی طرف بلاتا ہے اور اس میں بڑی کشش ہے، اس کا مضبوط جواز بھی ہے۔ پہاڑ کی چوٹی تک جانا آسان ہے لیکن دوسری طرف پرانے دور کی یادیں مسلسل بلاتی ہیں۔ روتی ہوئی، ہنستی ہوئی، ہر طرح کی آوازیں بلاتی ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ گزرے زمانے کی آوازوں پر مڑ کر دیکھنے والے شہزادے پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود میں نہ صرف مڑ کر دیکھتا ہوں بلکہ ہر

قدم پر مڑ کر دیکھتا ہوں اور خود کو مکمل پتھر ہونے سے بچانے کی کوشش بھی کرتا جاتا ہوں۔
''چٹھی میری ڈھول نوں پچائیں وے کبوترا'' جذباتی ہو کر سننا، پہاڑ پر جاتے ہوئے مڑ کر دیکھنے جیسا ہے اور ساتھ ساتھ ای میلز کے جواب لکھتے جانا خود کو مکمل پتھر ہونے سے بچانے کی کوشش ہے۔''

مجھے بہت سارے پرانے گانے پسند ہیں، ان سب کی اچھی موسیقی میری روح پر اثر کرتی ہے اور دل میں سوز و گداز بھی پیدا کرتی ہے۔ ان گانوں کے ساتھ میں حال میں رہتے ہوئے اپنے گزرے ہوئے زمانوں کا سفر کر لیتا ہوں۔

''کھٹی میٹھی یادیں''۔باب: روح اور جسم سے اقتباس

اب کہ عمر کے اس حصے میں ہوں جب بندہ اِس دنیا سے آگے کی دنیا میں جانے کے لیے بوریا بستر باندھنے میں لگا ہوتا ہے، میں نے بھی کچھ عرصہ سے اپنا بوریا بستر باندھنا شروع کر رکھا ہے۔ اگلی دنیا میں جانے کی تیاری کے ساتھ اِس دنیا سے لذت کشید کرنے کا عمل بھی میں نے کم نہیں ہونے دیا۔ میری اہلیہ مبارکہ ان معاملات میں ایک حد تک میرے ساتھ ہے اور ایک حد تک مزاحمت کر رہی ہے۔ اس دنیا کے معاملات میں تو نہ صرف اس نے مزاحمت نہیں کی بلکہ بڑی حد تک پردہ پوشی بھی کی ہے۔ البتہ اگلی دنیا کے معاملہ میں اس نے شدید مزاحمت کر رکھی ہے۔ اس حوالے سے جو تازہ ترین صورتحال ہے اسے بعد میں بیان کروں گا پہلے گزرے دنوں کا کچھ ذکر ضروری ہے۔

۱۹۹۶ء میں مبارکہ کو Rheumatism کی بیماری کی ابتدا ہوئی تھی۔ پہلے تو بیماری کی نوعیت سمجھ میں نہیں آئی۔ پتہ نہیں یہ ''روئے ماٹ ازم'' کونسی اللہ ماری ولایتی بیماری لاحق ہو گئی ہے۔ ہم نے تو سوشلزم، کمیونزم، کیپٹل ازم کے نام ہی سن رکھے تھے اور مبارکہ کو ان میں سے کسی سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ بہرحال بیماری کی نوعیت کا جب کچھ کچھ اندازہ ہوا تو اس کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے میں نے ۱۹۹۶ء ہی میں ایک غزل میں کہا تھا:

دیکھو مجھے اس حال میں مت چھوڑ کے جانا
دل پر ابھی میں نے کوئی پتھر نہیں رکھا

پھر مبارکہ نہ صرف اس بیماری کی عادی ہو گئی بلکہ Rheuma نے بھی اس کے ساتھ دوستانہ برتاؤ شروع کر دیا۔ بارہ تیرہ برس علاج معالجہ کے ساتھ آرام سے گزر گئے۔ مبارکہ کی علالت اور اپنے شروع میں بیان کردہ خواب کا مزید ذکر ذرا آگے چل کر۔۔۔۔

''کھٹی میٹھی یادیں''۔باب: لبیک الّٰھم لبیک سے اقتباس

---

۲۶ جنوری ۲۰۰۹ء کو میں نے صبح چار بجے کے لگ بھگ ایک خواب دیکھا۔ اس میں مجھے تاریخِ وفات ۳۱ردسمبر بتائی گئی۔ خواب میں سَن نہیں بتایا گیا لیکن بیداری پر مجھے اس کی جو تفہیم ہوئی اس کے مطابق سال ۲۰۰۹ء ہی میں وفات ہو گی۔ اس تفہیم کے ساتھ ایک بار پھر غنودگی کی کیفیت ہوئی اور اس میں یہ قرآنی الفاظ میرے ہونٹوں پر جاری ہوئے: **انی متوفیک**۔ یعنی بے شک میں تجھے وفات دوں گا۔

میں نے اسی روز صبح پانچ بجے سبز رنگ کی جلد والی اپنی نوٹ بک کے بائیں جانب اندر کے پہلے صفحہ پر وہ خواب، اور اس کی تعبیر و تفہیم درج کر دی، اپنے دستخط بھی کر دیئے۔ اسی روز اپنے چھوٹے بیٹے طارق کو وہ نوٹ بک دکھا کر بتا دیا کہ دسمبر ۲۰۰۹ء میں اگر کچھ رونما ہو جائے تو اس تحریر کو خود بھی پڑھ لینا اور بہن بھائیوں کو بھی پڑھا دینا۔ ساتھ ہی اسے کچھ اور ہدایات بھی دیں۔ لیکن ہوا یہ کہ طارق نے دو چار دن تک تو صبر سے کام لیا لیکن پھر گھبرا کر اپنی ماں کو اس بارے میں بتا دیا۔ مبارکہ کو خواب کی کچھ حقیقت کا اندازہ ہوا تو وہ خود بیمار پڑ گئی۔ یہاں تک کہ ۶ فروری کو ایمبولینس بلانا پڑ گئی۔ ہفتہ بھر صورتحال اتنی زیادہ نازک رہی کہ ڈاکٹرز نے صاف کہہ دیا کہ ہم اپنی طرف سے بچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ بچ جانے کے چانسز ہیں تو سہی لیکن بہت کم۔ کیونکہ قوتِ مدافعت کمزور ہوتے ہی Rheuma نے تقریباً تمام مرکزی اعضا پر حملہ کر دیا ہے۔ ان آرگنز کو بچانے کے لیے جن دواؤں کو دیا جا سکتا ہے وہ موجودہ صورت میں جتنی مفید رہیں

گی،سائڈ ایفیکٹ میں اس سے زیادہ نقصان دہ ہوں گی۔عجیب مشکل اور پیچیدہ صورتحال تھی۔بہر
حال دعا اور دوا دونوں کے نتیجہ میں مبارکہ نے ایک مہینہ کے لگ بھگ عرصہ میں بیماری کو کچھ کوَر کر
لیا۔شیمو تھراپی جو کینسر کے مریضوں کے لیے ہوتی ہے،اس کا پانچ فیصد چھ مہینوں میں آزمانے کا
طے ہو گیا۔پانچ مہینوں میں مبارکہ اس حد تک صحت یاب ہو گئی کہ مجھے باقاعدہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے
لگی۔کامیاب شوہر بخوبی جانتے ہیں کہ بیوی جب شوہر کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگے تو سمجھ لینا چاہیے
کہ وہ پوری طرح سے صحت یاب ہو چکی ہے۔وگرنہ ناکام و نامراد شوہر تو بیوی سے سرِ عام جوتے یا
دھکے کھا کر بھی کچھ نہیں سمجھ اور سیکھ پاتا،البتہ اس کے انجام سے لوگ سبق ضرور سیکھ لیتے ہیں۔

”کھٹی میٹھی یادیں“۔باب: لبیک الّٰھم لبیک سے اقتباس

فی الحال بات ہو رہی تھی مبارکہ کی اپنی سنگین بیماری کے وار سے بچ کر گھر واپس آ جانے کی۔

مبارکہ کا بہتر حالت میں گھر واپس آنا خدا کا بہت ہی خاص فضل تھا۔گردوں کی کارکردگی متاثر ہونے کے باعث اس کے پورے جسم سے پانی رِستا تھا۔خوشی سے بھیگنا اور غم میں آنسوؤں سے بھیگ جانا تو ہماری دنیا میں ہوتا ہے لیکن بیماری سے اس طرح بھیگنا ہمارے ہاں پہلا تجربہ تھا۔جسم بھی کسی حد تک پھول گیا تھا،تاہم تھراپی کرانے کے نتیجہ میں حالت تدریجاً بہتر ہوتی جا رہی تھی۔اس دوران مبارکہ کو نہانے کے لیے تو مدد کی ضرورت نہ ہوتی لیکن نہانے کے بعد کھڑا کرنے اور ٹب میں سے باہر نکالنے میں مجھے بہت زیادہ ہیلپ کرنا پڑتی۔

اپنے افسانہ”گھٹن کا احساس“میں ایک بار اپنی بیوی کے ساتھ ہوئی بات کو میں نے یوں لکھا ہوا ہے۔

” نہاتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنی پوری کمر پر نہیں پھر سکتا تھا۔ ماں کا کمر پر صابن مَلنا یاد آتا تو اس کا جی چاہتا کاش ماں زندہ ہوتی اور اب بھی میری کمر پر صابن مَل دیتی۔ایسے ہی خیالوں کے دوران ایک بار اُس نے اپنی بیوی کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔اس کی بیوی نہ صرف اس کی ماں کی بھتیجی تھی بلکہ بڑی حد تک اس کی ماں کی ہم شکل بھی تھی۔اس نے اپنی بیوی سے اس

خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ نہاتے وقت اس کی کمر پر صابن مَل دیا کرے۔اس کی بیوی تھوڑا سا شرمائی پھر کہنے لگی:”مجھ سے یہ فلموں والے باتھ روم کے سین نہیں ہو سکتے“

وہ بیوی کے جملے پر مسکرایا اور سوچا یہ پگلی کہاں جا پہنچی۔یوں بھی باتھ روم میں اتنی جگہ ہی کہاں ہے کہ وہ بھی میرے ساتھ سما سکتی۔“

اور اب صورت حال یہاں تک آ پہنچی تھی کہ ہم انڈین فلموں کے باتھ روم سے بڑھ کر انگریزی فلموں کے باتھ روم والے سین جیسی صورتحال سے گزر رہے تھے۔مبارکہ کا وزن بہت بڑھ گیا تھا اس لیے اس سین کا مزہ تو کیا لیا جاتا،میرا سانس ہی پھولنے لگتا۔یہ سانس پھولنے کا سلسلہ بڑھا تو ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ڈاکٹر نے ای سی جی تک کے اپنے سارے ٹیسٹ کرنے کے بعد مجھے ہسپتال ریفر کر دیا۔ہسپتال والوں نے ٹیسٹ کے کئی مراحل سے گزارنے کے بعد بتایا کہ دل کا کوئی وال(شریان)بند ہے۔انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی دونوں کام ایک ساتھ کر دیئے جائیں گے۔اس کے لیے یکم اکتوبر کی تاریخ دے دی گئی۔ انہیں دنوں میں ایک نئی غزل ہوئی،جس کے یہ اشعار جیسے ۳ر دسمبر کے لیے ذہنی تیاری کی غمازی کر رہے تھے۔

دردِ دل کی ہمیں اب کے وہ دوائی دی ہے
اپنے دربار تلک سیدھی رسائی دی ہے

اک جھماکا سا ہوا روح کے اندر ایسے
نوری برسوں کی سی رفتار دکھائی دی ہے

کیسے زنجیر کا دل ٹوٹا یہ اُس نے نہ سُنا
وقت نے قیدی کو بس فوری رہائی دی ہے

اک نئی لمبی مسافت کا زمیں زاد کو حکم
اور اس بار مسافت بھی خلائی دی ہے

جب بھی جانا ہے پلٹ کر نہیں دیکھیں گے کہیں
اپنے اندر سے یہ آواز سنائی دی ہے

اکیس ستمبر کو عید الفطر تھی، عید بہت اچھی گزری۔ سارے بچے گھر پر جمع ہوئے۔ پانچ بیٹے بیٹیاں، پانچ بہوئیں اور داماد، دس پوتے، پوتیاں اور نواسے۔۔ گھر پر اتنی رونق تھی کہ ہم دونوں تھک گئے۔ بائیس ستمبر کو میں ڈٹسن باخ میں خانپور کے زمانے کے ایک دوست وزیر احمد صاحب کو ملنے چلا گیا۔ شام کو گھر آیا تو مبارکہ کی طبیعت خراب تھی، بخار ہو گیا تھا۔ رات گئے تک بخار میں شدت آ گئی اور صبح تک حالت اتنی بگڑ گئی کہ اس کی لیڈی ڈاکٹر فراؤ ہے نگ (Frau Hennig) کو گھر پر بلانا پڑا۔ ڈاکٹر نے مبارکہ کی حالت دیکھتے ہی ایمبولینس منگالی۔ جاتے وقت مبارکہ پر غشی سی طاری تھی۔ اسے قریبی شہر ہوف ہائم کے ہسپتال میں لے جایا گیا۔ ۲۴ تاریخ تک حالت اتنی بگڑ گئی کہ اسے صوبائی صدر مقام ویزبادن کے اس ہسپتال منتقل کر دیا گیا جہاں پہلے سے اس کا ''روئے ما'' کا علاج چل رہا تھا۔ انتہائی نگہداشت والے کمرہ میں جب ہم دیکھنے کے لیے پہنچے تو دل دھک سے رہ گیا۔ وہاں کے ڈاکٹرز نے کہا کہ ہم بچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں لیکن اس طرح کے کیسز میں بچنے کا صرف ایک فی صد چانس ہوتا ہے۔ جو بچہ اندر آتا اور رونے لگتا میں اسے باہر بھیج دیتا۔ رفتہ رفتہ بچوں نے اپنے آنسوؤں پر قابو پانا شروع کیا۔

میں تو مستقل طور پر مبارکہ کے سرہانے کھڑا ہوا تھا، بچوں کو دو سے زیادہ تعداد میں آنے کی اجازت نہ تھی۔

جب بھی کوئی بچہ آتا۔ میں پوچھتا یہ کون ہے؟ آواز نہیں آتی تھی لیکن مبارکہ کے ہونٹ اس طرح ہلتے جس سے بچے کا نام ادا ہوتا ہوا پورا سمجھ میں آتا۔ حالت تو غیر ہی تھی لیکن تیسرے دن دو دلچسپ باتیں ہوئیں جس سے مجھے کچھ تسلی ہونے لگی۔ میں نئے کپڑے پہن کر ہسپتال پہنچا۔ مبارکہ نے آنکھ کھولی تو مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔ ''کتھے چلے او'' (آپ کہاں جا رہے ہیں؟) ۔ جب بیوی بے ہوشی اور بے خبری کی حالت میں بھی نگرانی کی اس حد تک آ جائے تو اسے کون بے ہوش یا بے خبر کہے گا۔

جب سارے بچے باری باری آ کر ماں سے مل چکے تو مبارکہ نے دوسری طرف پڑی ہوئی کرسی کی طرف آنکھ سے اشارہ کر کے کہا آپ اب وہاں بیٹھ جائیں۔ مجھے ان دونوں باتوں سے

کافی تسلی ہو گئی۔ لیکن کمال یہ ہے کہ جب مبارکہ بالکل صحت یاب ہو گئی تو اسے ان باتوں میں سے کچھ بھی یاد نہ تھا۔ صرف اتنا یاد تھا کہ بچوں کی پرچھائیاں سی دکھائی دیتی تھیں اور بس۔

مجھے اندازہ ہے کہ اصلاً مبارکہ کو اندر سے یہ خوف ہے کہ میں دنیا سے کوچ کرنے والا ہوں۔ فروری والی بیماری کے دوران میں نے اسے بڑے رسان سے کہا تھا کہ مبارکہ بیگم! آپ زیادہ فکر مت کریں، میں پہلے چلا گیا تو جاتے ہی آپ کو بلوا لوں گا۔ آپ پہلے چلی گئیں تو میں بھی زیادہ دیر یہاں نہیں رہوں گا، آپ کے پیچھے پیچھے ہی چلا آؤں گا۔ لیکن شاید ہم دونوں کے درمیان اہلِ لکھنو کے ''پہلے آپ۔۔۔۔ پہلے آپ'' کے برعکس ''پہلے میں۔۔۔ پہلے میں'' کا مقابلہ چلا ہوا ہے۔ اس چکر میں شاید موت کا فرشتہ بھی کنفیوز ہو رہا ہے کہ ان دونوں میاں بیوی نے مجھے کس چکر میں ڈال دیا ہے۔ پہلے کسے لے جاؤں؟

۲۹ ستمبر ۲۰۰۹ء کو مبارکہ ابھی انتہائی نگہداشت والے روم میں تھی، گردن میں، ہاتھ پر، سینے پر، بازو پر مختلف کنکشنز لگے ہوئے تھے۔ ایک بازو اور ہاتھ کے الٹی طرف ڈرپیں لگانے کے لیے، ایک بازو پر بوقتِ ضرورت ٹیسٹ کرنے کی غرض سے خون لینے کے لیے، گردن اور سینے پر کہیں ڈائلسز کے لیے، کہیں کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ کے لیے اور کہیں پتہ نہیں مزید کن کن مقاصد کے لیے کنکشن کی تاریں ہی تاریں لگی ہوئی تھیں۔ مبارکہ کیا تھی، اچھی بھلی روبوٹ دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے روبوٹ کو بالکل انسان جیسا دکھائی دینے کا تجربہ کر لیا گیا ہو۔

''کھٹی میٹھی یادیں''۔ باب: لبیک الھم لبیک سے اقتباس

جب شیراز کی پیدائش ہوئی مبارکہ ہسپتال میں تھی۔ ہسپتال سے چھٹی ملتے ہی سب سے پہلے اس ہسپتال میں گئی جہاں شیراز کی پیدائش ہوئی تھی، وہاں پوتے کو دیکھا، چوما، دعا کی اور پھر گھر واپس آئی۔ اپنے دو نواسوں اور ایک پوتے کے ختم قرآن کا ذکر یادوں کے ایک باب میں کر چکا ہوں۔ اس عرصہ میں مزید پیش رفت یہ ہوئی کہ گزشتہ برس عثمان کے بیٹے اور میرے دوسرے پوتے جہاں زیب نے فروری میں ساڑھے پانچ برس کی عمر میں قرآن شریف ختم کر لیا۔ اس برس

جولائی میں جہانزیب کی بہن علیشا نے پونے پانچ سال کی عمر میں قرآن شریف ختم کرلیا۔ماہ نور بھی بیس پارے پڑھ چکی ہے اوراگلے دوتین ماہ تک اس کے ختم شریف کی بھی امید ہے۔سو اپنی ذاتی زندگی کی اس سال کی اچھی خبروں میں ان خبروں کو بھی شمار کرتا ہوں۔

ایک بار پھر **شکر الحمدللہ**!

یہاں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ویسے تو سارے بچے بہت فرمانبردار اور خیال رکھنے والے ہیں۔ہمارے عمرہ اور حج کی توفیق میں ان کا بھرپور ساتھ شامل رہا ہے۔جب مجھے کسی ذاتی کام کے لیے رقم کی ضرورت پیش آئی اور میں نے تینوں بیٹوں کے ذمہ کچھ رقم لگائی،سب نے وہ رقم فراہم کردی۔عام حالات کے مطابق میرے کہے بغیر بھی طارق نے دوتین اہم مواقع پراز خود میری ضرورت کا احساس کرتے ہوئے مجھے خاصی معقول رقم فراہم کی ہے۔تاہم مجھے پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ بڑا بیٹا شعیب ایک عرصہ سے ہر سال ایک معقول رقم خاموشی کے ساتھ ماں کو دے رہا ہے۔مجھے کئی برس کے بعد اب علم ہوا تو میں نے دونوں ماں بیٹے کو نصیحت کی کہ مجھے اس کا علم ہونا چاہیے تھا تا کہ میں تحدیث نعمت کے طور کہیں اس کا ذکر کردیتا۔خدا کا شکر ہے کہ اب مجھے اس کا ذکر کرنے کا موقعہ مل گیا ہے۔

''کھٹی میٹھی یادیں''۔باب:لبیک الھم لبیک سے اقتباس

ماہ نور کا حال پوچھا۔گھنٹہ بھر باہر گھومنے کے بعد ہسپتال میں واپس آ گیا۔اگلے دن دوپہر کے بعد مجھے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔اسی دن شام کو مبارکہ سے ملنے گیا۔وہ انتہائی نگہداشت والے روم سے اب درمیانی نگہداشت والے روم میں منتقل ہوگئی تھی۔ہوش میں آ گئی تھی لیکن کوئی جنبش از خود نہیں کرسکتی تھی۔اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں خود اپنے دل کے معاملے سے نمٹ کر آرہا ہوں۔ابھی اسے اپنے بارے میں یا ماہ نور کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔جیسے جیسے مبارکہ روبصحت ہورہی تھی ویسے ویسے ماہ نور کی حالت بھی بہتر ہورہی تھی۔اس کا چہرہ تو خدا نے اپنے فضل سے محفوظ کردیا تھا۔سینے کے بیشتر داغ بھی کم ہورہے تھے اور ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ بچی بہت

چھوٹی ہے اس لیے ایک سے دوسال تک یہ داغ بھی دور ہو جائیں گے۔

مبارکہ کو جب مختلف کنکشنز سے آزاد کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو جہاں جہاں سے سوئی وغیرہ کو ہٹاتے،وہاں گہرے سرخ داغ نمایاں ہو جاتے۔تن ہمہ داغ داغ شد والا منظر تھا۔پنبہ کجا کجا نہم کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ایک دن کے بعد یہ گہرے سرخ داغ جیسے نیلے سے رنگ میں ڈھلنے لگے اور مجھے پنجابی کا ''تن من نیل و نیل'' یاد دلانے لگے۔(ویسے کمال ہے کہ ایک مہینہ کے اندر ہی وہ گہرے داغ ایسے ختم ہو گئے ہیں جیسے کبھی تھے ہی نہیں)۔

۲۳/اکتوبر کو مبارکہ کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی لیکن اس خبر کے ساتھ کہ ہفتہ میں تین بار ڈائلے سز ہوا کرے گا۔سرکاری طور پر ہی سارا انتظام کیا گیا ہے۔مقررہ وقت پر ٹیکسی آتی ہے اور گھر سے ہسپتال لے جاتی ہے،چار سے پانچ گھنٹے کے درمیان ڈائلسز کا عمل مکمل ہوتا ہے تو ٹیکسی گھر چھوڑ جاتی ہے۔مبارکہ کی بیماری،اپنی پوتی ماہ نور کے حادثہ اور اپنے دل کے علاج تک تین چار ہسپتالوں سے واسطہ رہا۔کہیں بھی امیر یا غریب،جرمن یا غیر جرمن کا فرق دکھائی نہیں دیا،کہیں بھی ہسپتال کے عملہ میں دیکھ بھال کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔وہ جو مسیحانہ مقام تھا ہر جگہ دکھائی دیا۔انسانی خدمت کا ایسا اعلیٰ معیار کہ سوچنے بیٹھیں تو آنکھیں شکر گزاری سے بھیگ جائیں۔ہمارے معاشرے کے لوگ اپنی ذہنیت کے مطابق اان کے بارے کیا کچھ باور کرتے ہیں لیکن میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ اپنی خدمتِ انسانی کے اعلیٰ ترین معیار کے باعث ان لوگوں نے سچ مچ اپنی جنت کمالی ہے۔

اپنی اس علالت کے نتیجہ میں مبارکہ کا وزن پچاس کلو کے لگ بھگ رہ گیا۔بیشتر کپڑوں کی نئی فٹنگ کرانی پڑی،چھوٹی بیٹی کا شادی سے پہلے کا ایک کوٹ پورا آ گیا۔اب بہو بیٹیوں میں حسرت کے ساتھ مبارکہ کو دیکھا جاتا ہے کہ ہائے امی! آپ اتنی سمارٹ ہوگئی ہیں۔

''کھٹی میٹھی یادیں''۔باب:لبیک الھم لبیک سے اقتباس

پہلی بار آپریشن وارڈ سے جنرل وارڈ تک پہنچا تھا تو طارق،نازیہ اور شایان فوراً ہسپتال پہنچ گئے

تھے۔اب دوسری بار جنرل وارڈ میں پہنچا تو مبارکہ، طارق، نازیہ اور شایان کے ساتھ پہنچ گئی تھی۔دوسرے دن جب چھٹی نہیں ملی تو مبارکہ، شعیب اور عثمان ایک ساتھ ملنے آ گئے۔اب عمر کے اس حصے میں اور بیماریوں کی اس یلغار میں مبارکہ اور میں ایک دوسرے کی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں۔بعض عزیز اور دوست احباب ہم دونوں کی خیریت دریافت کرنے لگے تو میں نے کہا ہم دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی دیکھ ریکھ کرتے رہتے ہیں ۔مثلاً میں مبارکہ سے کہتا ہوں آپ آرام سے بیٹھیں، میں چائے تیار کرکے لاتا ہوں۔مبارکہ جواباً کہتی ہے نہیں آپ آرام سے بیٹھیں میں چائے تیار کرکے لاتی ہوں۔ہم دونوں کا جذبہ دیکھ کر چائے کہتی ہے آپ دونوں آرام سے بیٹھیں میں خود ہی تیار ہو کر آ جاتی ہوں۔

''کھٹی میٹھی یادیں''۔باب: لبیک الّھم لبیک سے اقتباس

تین تاویلیں ایسی ہیں کہ میں انہیں یہاں درج کرنا چاہوں گا۔میرے ماموں صادق باجوہ کا کہنا ہے کہ خواب میں موت سے مراد لمبی عمر ہے۔میرے خیال میں خواب میں کسی زندہ انسان کی موت کی خبر ملنا یا اسے مردہ دیکھنا تو اس کی لمبی عمر کی علامت ہو سکتی ہے لیکن اس طرح معین تاریخ وفات کی خبر سے مراد لمبی عمر شاید نہیں بنتی۔باقی واللہ اعلم۔

کینیڈا سے عبداللہ جاوید صاحب کی تاویل مجھے مزے کی لگی۔ان کے بقول: جیسے کسی بچے کو کسی شرارت یا کام سے روکنے کے لیے کسی تاریک کمرے کا دروازہ ہلکا سا کھول کر دکھایا جائے اور پھر دروازہ بند کرکے بچے کو ڈرایا جائے کہ اگر تم شرارت سے باز نہ آئے تو تمہیں اس کمرے میں بند کر دیا جائے گا۔بالکل اسی طرح ۳ دسمبر کی تاریخ بتا کر اللہ میاں نے موت کے تاریک دروازے کا ڈراوا دیا تھا۔لیکن یہ ضدی بچہ شرارت کو چھوڑ کر دروازے کے اندر میں دلچسپی لینے لگا۔دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا کہ شرارت ورارت کا معاملہ چھوڑیں یہ دروازہ کھولیں مجھے اس کمرے میں جانا ہے۔دیکھوں تو سہی اندر کیا ہے۔جب دروازہ نہیں کھلا تو ۲۶ نومبر آنے تک اس نے زور زور سے دروازہ کھٹکانا شروع کر دیا، اور پھر ۲۶ نومبر سے ۳ دسمبر تک اس بچے نے

دروازہ کھٹکھٹانا اور شور مچانا جاری رکھا۔

ایک طرف تعبیر و تاویل کا یہ سلسلہ تھا دوسری طرف بعض دوستوں کا کہنا تھا کہ خواب غلط ثابت ہو چکا ہے۔اس پر میری اہلیہ مبارکہ نے بڑی انوکھی نشان دہی کی۔مبارکہ کی تاویل بیان کرنے سے پہلے دو وضاحتیں کر دوں۔پہلی وضاحت: اپنے قریشی ہونے کی نسبت سے، اپنی تمام ترکوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود میں خود کو ہمیشہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کی آل میں شمار کرتا ہوں۔مجھے گہرا احساس ہے کہ روحانی سطح پر مجھ خاک کی اُس عالمِ پاک سے کوئی نسبت نہیں ہے۔پر کچھ ہے تو سہی۔دوسری وضاحت: خواب کی تعبیر و تاویل میں جو ایک مماثلت کا بیان آگے آنے والا ہے، وہ صرف خواب کی تفہیم کے سلسلہ میں ایک مثال کے طور پر ہے، وگرنہ میں ابراہیمی سمندر کے سامنے ایک قطرہ اور صحرا کے سامنے ایک ذرہ جتنی وقعت کا بھی حامل نہیں ہوں۔یہ وضاحت اس لیے نہیں کر رہا کہ کوئی مذہبی انتہا پسند میری بات سے کوئی اشتعال انگیزی نہ کر گزرے۔بلکہ اس لیے کر رہا ہوں کہ اس اظہار کے نتیجہ میں کہیں میرے اپنے اندر کوئی فتور نہ آ جائے۔بس میری یہ تحریر مجھے میری اوقات کا احساس دلاتی رہے۔

ان وضاحتوں کے بعد مبارکہ کی بیان کردہ تعبیر و تاویل پیش کرتا ہوں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو خدا کی راہ میں قربان کر رہے ہیں۔انہوں نے بیٹے کو اپنا خواب بتایا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فوراً خواب کو پورا کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔اب صورتحال یہ بنی کہ باپ بیٹے کو قربان کرنے کے لیے تیار ہے اور بیٹا قربان ہونے کو تیار ہے۔جب خدا نے دیکھا کہ باپ بیٹا دونوں اس کی رضا پر راضی اور اس کے حکم کی تعمیل پر کمر بستہ ہیں تو قربانی کے حکم کے باوجود ذبح کرنے سے روک دیا گیا اور خواب کی تعبیر مینڈھا بھیج کر پوری کر دی گئی۔یوں خواب دوسرے رنگ میں پورا ہو گیا۔

''کھٹی میٹھی یادیں''۔باب: زندگی درزندگی سے اقتباس

مبارکہ کا ہفتہ میں تین بار ڈائلسز کا سلسلہ جاری ہے اور اب ایک طرح سے معمولاتِ زندگی

میں شامل ہے۔۱۶،۱۷اپریل کی درمیانی رات اسے بے چینی ہونے لگی۔شوگر اور بلڈ پریشر چیک کیےتو سب نارمل تھےالبتہ نبض کی رفتار مدھم تھی۔۴۰ سے۴۳ کے درمیان۔دواڑھائی گھنٹےاپنے ٹوٹکے کرنے میں گزار دیئے۔صبح ساڑھے پانچ بجے بڑے بیٹے کے گھر فون کیا۔تسنیم سے بات ہوئی۔اس نے فوراً قریبی شہر ہوف ہائم کے ہسپتال میں فون کیا۔چھ بجے وہاں کا ڈاکٹر ہمارے گھر پہنچ گیا۔نبض کے بارے میں جان کر اس نے دستی ای سی جی مشین بھی ساتھ رکھ لی تھی۔مبارکہ کی صورتحال دیکھ کر اس نے گھر پر ہی ای سی جی ٹیسٹ شروع کر دیا۔دل میں گڑ بڑ ہونے کے سگنل مل رہے تھے۔ساڑھے چھ بجے اس نے ایمبولینس بلا لی۔ایمبولینس والوں نے آتے ہی اپنی کاروائی شروع کر دی۔وہ اسٹریچر پر ڈال کر لے جانا چاہتے تھے۔ہم اپنی بلڈنگ کی ساتویں منزل پر رہتے ہیں۔میرے پاس ہاؤس ماسٹر کا فون نمبر نہیں تھا۔ہاؤس ماسٹر سے سارے معاملات چھوٹا بیٹا ٹیپو خود ڈیل کرلیا کرتا ہے۔ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ لفٹ کی چابی منگائیں تا کہ مریضہ کو اسٹریچر پر ہی لے جایا جا سکے۔میں نے ٹیپو کے گھر فون کیا،موبائل پر فون کیا،مگر سارے فون بند تھے۔پانچ منٹ کا پیدل رستہ ہےاس دوران میں نے خود جا کر اس کے گھر پر بیل دی اور پیغام دیا کہ فوراً ہمارے ہاں پہنچو۔ان لوگوں کے پوری طرح بیدار ہونے ،تیار ہونے اور ہمارے ہاں پہنچنے میں اتنا وقت لگ گیا کہ تب تک ڈاکٹرز مزید انتظار کیے بغیر مبارکہ کو وہیل چیئر پر بٹھا کر ہی لے گئے۔تینوں بیٹے ہمارے گھر کے اتنے قریب ہیں کہ کسی ایمر جینسی میں بلانے پر پانچ منٹ کے اندر گھر پر پہنچ سکتے ہیں۔ہر چند آج بڑی بہو تسنیم کو جتنا کام سونپا گیا اس نے احسن طریقے سے کر دیا اور اسی کے نتیجہ میں ڈاکٹر اور ایمبولینس بروقت پہنچ چکے تھے۔لیکن آج ایمر جینسی میں یہ تجربہ بھی ہوا کہ سب سے قریب مقیم بیٹا اس وقت ہم تک پہنچا جب اس کے آنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔اس سے اندازہ ہوا کہ قدرت کی طرف سے آسانی ہو تو دور والے بھی قریب ہیں اور اگر الجھن پیدا ہونی ہے تو سب سے قریب والے بھی دور ہیں۔سبق ملا کہ بچوں کی سعادت مندی پر ان کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے لیکن بھروسہ صرف اور صرف اپنے خدا پر ہی رکھنا چاہیے۔اس کا فضل ہے تو ہر طرف سے ہر طرح خیر ہے۔

ساڑھے سات بجے ایمبولینس والے مبارکہ کو ساتھ لے کر گئے تھے اور ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ مبارکہ کا فون آ گیا کہ انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی کے دونوں مرحلے طے ہو گئے ہیں۔گویا اب ہم دونوں میاں بیوی ہارٹ کلب کے ممبر بن گئے ہیں۔میں نے تو مبارکہ کی کسی بیماری میں شراکت نہیں کی لیکن وہ میرے دل کی بیماری میں حصہ دار بن گئی۔اگلے دن اس کے ڈائلسز کی باری تھی۔۲۳اپریل کو شام تک ڈائلسز کے بعد مبارکہ کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔

’’کھٹی میٹھی یادیں‘‘۔باب:زندگی در زندگی سے اقتباس

کھانے پینے کے ذکر سے خیال آیا،جرمنی میں رہتے ہوئے ہم لوگ پاکستانی کھانے ہی کھاتے رہے ہیں۔لیکن اب کھانے کے معمولات میں کچھ تبدیلی کی ہے۔ناشتہ میں ہم میاں بیوی اپنی اپنی پسند کی بریڈ لیتے ہیں۔دوپہر کو پاکستانی کھانا ہوتا ہے۔مبارکہ شام کو بھی پاکستانی کھانا کھاتی ہے لیکن میں نے شام کو بریڈ لینا شروع کر دی ہے۔ویسے پاکستانی کھانوں میں عام گوشت،سبزی اور دال کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار چپلی کباب،نہاری اور پائے کی بد پرہیزی بھی کر لیتے ہیں۔ویسے آجکل ہماری پسندیدہ ڈش گڑ کے چاول ہے،اگرچہ یہ بچپن کی پسندیدہ ڈش کے طور پر بہت کچھ یاد دلاتی ہے لیکن اس میں ہر طرح کے میوہ جات کی شمولیت بہت کچھ بھلا بھی دیتی ہے۔کبھی کبھار یہ ڈش بنتی ہے تو میں جی بھر کے بد پرہیزی کر لیتا ہوں۔

’’کھٹی میٹھی یادیں‘‘۔باب:زندگی در زندگی سے اقتباس

۲۴مئی کو جرمنی میں سرکاری چھٹی تھی۔اس دن بارش نہیں ہونا تھی۔کئی دنوں سے چل رہی ٹھنڈ کے برعکس موسم خاصا بہتر تھا۔چمکتی ہوئی لیکن نرم دھوپ میں ۲۵ ٹمپریچر نے فضا کو خوشگوار بنا دیا تھا(اس دن پاکستان کے بعض شہروں میں ٹمپریچر ۵۲ ہو گیا تھا)۔ہم نے ،پوری کی پوری فیملی نے اپنے گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے دریائے مائن کے کنارے پکنک منانے کا طے کر لیا۔اپنی اپنی سہولت کے مطابق پانچوں بچوں نے جو پکانا مناسب سمجھا پکا کر لے آئے اور سب دریا کے

کنارے پر جمع ہو گئے۔چھوٹے بچے، پوتے، پوتیاں،نواسے جو ہمارے گھر میں کھیلتے ہیں تو لگتا ہے کہ اودھم مچا رہے ہیں۔اب یہاں کھل کر کھیل رہے تھے،اودھم مچا رہے تھےلیکن سب اچھا لگ رہا تھا۔گزشتہ برس کی بیماریوں کی یلغار کے بعد مبارکہ پہلی بار دریا کے کنارے پہنچی تو یہ سب کچھ خواب جیسا لگ رہا تھا۔ بیماریوں کے حملہ سے پہلے ہم دونوں میاں بیوی کئی بار چہل قدمی کرتے ہوئے دریا کے اس کنارے تک آئے ہیں اور کئی بار یہاں کے بنچوں پر دیر تک بیٹھے قدرتی مناظر کا نظارہ کرتے رہے ہیں۔لیکن گزشتہ برس ۲۰۰۹ء میں ہم جس نوعیت کی سنگین بیماریوں سے گزرے ہیں،اس کے بعد سوچا نہیں تھا کہ مبارکہ اس طرح پھر سے ہنستے کھیلتے ہوئے دریا کے کنارے تک پہنچے گی۔لیکن خدا کے فضل سے ایسا ہو گیا تھا۔ ہمارے لیے یہ پکنک بھی خدا کی شکر گزاری کا جواز بن گئی۔دریا کے دوسرے کنارے پر بھی پکنک منائی جا سکتی تھی لیکن بچے اسی طرف رہنے پر مصر تھے کیونکہ یہاں کی گراؤنڈ وسیع تھی۔کھیلنے اور بھاگنے دوڑنے کے لیے کھلی جگہ تھی۔دوسری طرف صرف بیٹھنے کے لیے دو تین بنچوں کا ہی انتظام تھا۔چھٹی والے دنوں میں دریا کے دوسرے کنارے پر لے جانے کے لیے ایک کشتی موجود ہوتی ہے۔کرایا واجبی سا ہوتا ہے۔میں اپنے پوتوں، پوتیوں اور نواسوں کو لے کر دریا کے دوسرے کنارے پر لے گیا۔بچوں نے اس مختصر سے دریائی سفر کا لطف لیا لیکن دوسرے کنارے پر پہنچ کر واپسی کا شور مچا دیا۔اصل میں وہ کشتی میں ہی سفر کرتے رہنا چاہتے تھے۔ مجھے ہرمن ہیسے کا ناول ’’سدھارتھ‘‘ بہت پسند ہے۔ دریا کی آوازیں سننا اور ان کا گیان حاصل کرنا بڑی بات تھی لیکن ہرمن ہیسے کے سدھارتھ نے میرے پوتوں ،پوتیوں اور نواسوں کی معصوم اور زندگی سے بھرپور آوازوں کے ساتھ دریا کی آواز کو سنا ہوتا تو اسے ایک اور طرح کا گیان بھی نصیب ہو جاتا۔میں اپنے بچوں کے بچوں میں اپنے ماضی،حال اور مستقبل سمیت اپنی ساری کائنات کا عکس دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔۔

’’کھٹی میٹھی یادیں‘‘۔باب:زندگی در زندگی سے اقتباس

انسانی زندگی ایک سفر جیسی ہے۔۱۳ جنوری ۲۰۱۲ء کو اپنی زندگی کے سفر میں ساٹھ برس کا ہو چکا

ہوں۔سال ۲۰۰۹ء میری زندگی میں ایسی بیماریوں،دکھوں اور تکالیف کا سال بن کر آیا تھا کہ اب ان کا سوچ کر بھی حیرت ہوتی ہے۔میں اور میری فیملی کیسے سنگین حالات سے کیسے حوصلے اور کیسے اطمینان کے ساتھ گزرتے چلے گئے، یہ سراسر خدا کا فضل و کرم تھا۔اُسی نے ابتلا اور آزمائش میں ڈالا تھا اور اسی نے اس میں سے کامیاب و سرخرو کر کے زندگی کے سفر کو جاری رکھا ہوا ہے۔میری اہلیہ دو بار موت کی سرحد تک پہنچ گئی تھیں،اور دونوں بار ہماری پوری فیملی اللہ میاں کی منت کر کے انہیں واپس لے آئی۔دوسری بار واپسی تو ہو گئی لیکن ساتھ ہی ہفتہ میں تین بار ڈائلے سز کی شرط لاگو ہو گئی۔ہمارے خاندان میں جو عزیز و اقارب ڈائلے سز پر آئے چار سے چھ مہینے کے اندر وفات پا گئے۔خود مبارکہ کے والد اور میرے ماموں پروفیسر ناصر احمد بھی بمشکل چار مہینے ڈائلے سز پر رہے اور پھر وفات پا گئے۔مبارکہ نے سوا سال سے زیادہ عرصہ ہفتہ میں تین بار ڈائلے سز کی مشقت اٹھائی۔اس دوران ہم نے گردوں کے عطیہ کے لیے درخواست دے دی تھی۔گردے مل جائیں تو ٹرانسپلانٹیشن کے بعد ڈائلے سز سے نجات مل جاتی ہے۔عام طور پر مطلوبہ گردوں کے ملنے میں کئی برس گزر جاتے ہیں لیکن خدا کے فضل سے مبارکہ کے لیے سوا سال کے اندر ہی اس کا انتظام ہو گیا۔ لیکن یہ انتظام بس خوشی کی ایک خبر جیسا ہی تھا۔ایک طرف ڈائلے سز والے ڈاکٹر کا کہنا تھا ایسا لگتا ہے کہ ناکارہ گردے کام کرنے لگ گئے ہیں۔ڈاکٹر نے اپنی تسلی کے لیے مختلف قسم کے ٹیسٹ شروع کرائے۔دوسری طرف فروری ۲۰۱۱ء میں فرینکفرٹ کے ڈونر ادارہ کی جانب سے فون آ گیا کہ آپ کے مطلوبہ گردے مل گئے ہیں۔میں نے انہیں ڈائلے سز والے کلینک کا نمبر دے دیا اور کہا کہ ان سے بات کر لیں۔وہاں سے ڈاکٹر نے انہیں بتایا کہ آپ اپریل ۲۰۱۱ء تک یہ گردے ریزرو رکھیں،لیکن ہو سکتا ہے ہمیں ان کی ضرورت پیش ہی نہ آئے۔اور یہی ہوا،خدا کی رحمتِ خاص نے معجزے جیسا ہی کچھ کر دیا۔ٹرانسپلانٹیشن تو رہی ایک طرف ڈائلے سز کی بھی ضرورت نہ رہی۔سارے ٹیسٹ صحت میں بہتری کی نشان دہی کر رہے تھے۔سوا سال سے زیادہ عرصہ ہفتہ میں تین بار ڈائلے سز پر رہنے کے بعد مبارکہ کو ڈائلے سز سے نجات مل گئی۔ **الحمد لله،ثم الحمد لله**۔ ۱۱ فروری ۲۰۱۲ء کو ڈائلے سز کے بغیر ایک سال مکمل ہو گیا ہے،بغیر ڈائلے سز کے

سب کچھ ٹھیک جا رہا ہے۔صرف دواؤں سے ہی زندگی کا سفر جاری وساری ہے۔۲۰۱۲ء کا آغاز اس خوشخبری کو مستحکم کرتا ہوا آیا۔

''کھٹی میٹھی یادیں''۔باب:زندگی کا یادگار سفر سے اقتباس

فاصلہ اور قربت ایک دوسرے کے لئے اسی طرح لازم وملزوم ہیں جس طرح ایٹم کا ہر اینٹی پارٹیکل اور پارٹیکل۔رات اور دِن۔اہرمن اور یزداں۔اور میری بیوی اور میں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔(میری بیوی اور میرے معاملے میں آپ لازم وملزوم کی بجائے''لازم و ملزم''سمجھیں۔الزامات کی نوعیت وہی ہے جو یورپ میں ہر شریف شوہر کو اپنی بیوی سے سننا پڑتے ہیں)۔

انشائیہ''فاصلے،قربتیں''سے اقتباس

افسانہ

میں انتظار کرتا ہوں!

خزاں رسیدہ سہی پھر بھی میں اگر چاہوں
جہاں نگاہ کروں اک نئی بہار اُگے

میں سوتیلے جذبوں کے عذابوں سے گزرتا ہوں کہ مجھے اپنا سفر مکمل کرنا ہے۔
میں کسی صحرا میں پیاس کی شدّت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔
اور ماما کی ماری میری ماں پانی کی تلاش میں ہلکان ہوتی پھر رہی ہے۔
میں کسی اندھے کنوئیں میں گرا پڑا ہوں۔
اور میرے بھائی ان سوداگروں سے بھی میری قیمت وصول کر رہے ہیں جو کچھ دیر بعد مجھے اس کنوئیں سے نکالیں گے اور غلام بنا کر لے جائیں گے۔
میں کسی جنگل میں بَن باس کے دن گزار رہا ہوں۔
مری بیوی مجھے ہرن کا شکار لانے کے لیے کہتی ہے۔میں ہچکچاتا ہوں مجھے معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوگا مگر پھر میں بیوی کی خواہش پوری کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔

☆☆

میں کہ سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔
میری تاریخ کے سفر کا ایک حصہ مکمل ہو گیا ہے''لچھمن ریکھا''عبور ہوتے ہی تاریخ کے سفر کا دوسرا حصہ شروع ہو گیا ہے۔میں کسی غیبی امداد کا منتظر ہوں۔
میں اندھے کنوئیں سے نکال لیا گیا ہوں۔

مگر میں ابھی تک اندھے کنوئیں میں ہوں کہ زلیخا میرے تعاقب میں ہے اور میں گناہ کے اندھے کنوئیں سے نکلنے کے لئے مسلسل دوڑ رہا ہوں۔

پیاس کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

اور میری ماں جو دوڑتے دوڑتے تھک کر چُور ہو گئی ہے۔ابھی تک پانی کی تلاش میں سرگرداں ہے اس کے اپنے ہونٹوں پر پیاس کی پپڑیاں جم گئی ہیں۔مگر دور دور تک کسی قافلے کے آثار نظر نہیں آتے۔

میری بے گناہی۔۔۔میری نیکیاں دنیا نہیں دیکھتی اور میں تہمتوں کی زد میں ہوں۔

میں اذیت میں ہوں کہ میری ماں ابھی تک میری خاطر پانی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

وہ جو بادشاہ زادی ہے۔میرے سوتیلے بھائی اسے لونڈی اور مجھے لونڈی کا بیٹا کہتے ہیں۔

میں دکھ میں ہوں کہ حاکم کی بدکار بیوی مجھے میری نیکی کی کڑی سزا دلواتی ہے۔

میں قید میں ہوں کہ بدکاری کی تہمت مجھ پر عائد کر دی گئی ہے۔

اور میرا سینہ تنگ ہوتا ہے کہ میری پاک دامن بیوی پر بدکاری کا الزام عائد کیا گیا ہے۔

یہ سارے جھوٹے الزام اور تہمتیں وہی لگا رہے ہیں جو خود بدکار ہیں۔جو میرے سوتیلے عزیز ہیں۔

وہ میرے گرد سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کا ایندھن جمع کر رہے ہیں تا کہ اس میں نفرتوں کی آگ لگا کر مجھے بھسم کر ڈالیں۔

میں اس آگ سے بچنے کے لئے دعا کرتا ہوں کہ میں بے حد کمزور ہوں۔

☆☆

میں وہی ہوں کنواریاں جس کے لیے ہزاروں برس سے انتظار کر رہی تھیں۔

اور میں وہی ہوں.....چاند،سورج اور ستارے جس کے آگے سجدہ ریز ہوں گے۔

اور میں وہی ہوں جو اپنے باپ کے تخت کا حقیقی وارث ہے۔

مگر میں سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔

میں سوچتا ہوں۔

میں کن امتحانوں آزمائشوں اور ابتلاؤں سے گزر رہا ہوں؟

میری پاکدامن بیوی کی صفائی کون دے کہ میرا واسطہ بدکاروں سے ہے جو اپنی برائیاں چھپانے کے لئے دوسروں پر تہمتیں عائد کرتے ہیں۔

اور میری اپنی صفائی کون دے کہ میں اب بھی گناہ پر آمادہ ہو جاؤں تو وہی عورت میری بے گناہی کی گواہی دے کر مجھے چھڑا لے جائے گی جس نے مجھے اس حال تک پہنچایا ہے۔

اور میری ماں.... بادشاہ زادی....جو میری حالت نہیں دیکھ سکتی اور اس کی بے قراری دیکھ کر میرا اپنا دِل خون ہوتا ہے اور میں پہلے سے زیادہ زور کے ساتھ ایڑیاں رگڑنے لگتا ہوں، وہ کب تک پانی کی تلاش میں پہاڑیوں کا سفر کرتی رہے گی۔

☆☆

سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کا ایندھن میرے چاروں طرف جمع کیا جا چکا ہے اس ایندھن کے انبار پہاڑوں کی بلندیوں تک پہنچتے ہیں۔

وہ صحرا جس میں، میں ابھی تک پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں اور میری ماں پانی کی تلاش میں چکراتی پھر رہی ہے،

اور وہ اندھا کنواں جس میں مجھے ڈالا گیا تھا اور وہ جیل جس میں، میں اس وقت قید ہوں،

اور وہ جنگل جس میں مجھے اپنے بن باس کے سارے دن گزارنے ہیں،

سب اس ایندھن کے حصار میں آ گئے ہیں۔ایندھن کے اس حصار کی دوسری طرف میرے سوتیلے عزیز جشن منا رہے ہیں، میری تضحیک کر رہے ہیں، قہقہے برسا رہے ہیں۔اور وہ لمحہ قریب آتا جا رہا ہے جب وہ اس ایندھن میں نفرت کی آگ لگائیں گے۔آگ چاروں طرف پھیل جائے گی۔

تب یہ صحرا، یہ اندھا کنواں، یہ جنگل اور میں ...میری بے گناہی اور سچائی کے سارے نشان اس آگ میں جل کر فنا ہو جائیں گے۔مٹ جائیں گے۔اور میرے سوتیلے عزیزوں کے سوتیلے جذبوں کے ظلم کا کوئی ثبوت باقی نہیں رہے گا۔تب میرے سوتیلے عزیز اپنی مرضی کے مطابق میری تاریخ لکھیں گے، تب وہ اطمینان سے لکھیں گے کہ:

میں بدکار تھا اور میری بیوی بھی بدکار تھی اور میری ماں لونڈی تھی...مگر میرا باپ؟

☆☆

میں پھر سوچنے لگتا ہوں

میں جو صحرا میں پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔ابراہیم کا بیٹا ہوں۔

اور میں جو جرم بے گناہی میں قید بھگت رہا ہوں،ابراہیم کا پوتا ہوں۔

اور میں جو جنگل میں بن باس کے دن کاٹ رہا ہوں۔میں بھی ابراہیم کی آل سے ہوں کہ سچ کی راہ پر چلنے والے اور ظلم کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے والے ابراہیم کی آل میں شمار ہوتے ہیں۔

میں وہی ہوں کنواریاں جس کے لئے ہزاروں برسوں سے انتظار کر رہی تھیں۔

اور میں وہی ہوں۔۔چاند سورج اور ستارے جس کے آگے سجدہ ریز ہوں گے۔

اور میں وہی ہوں جو اپنے باپ کے تخت کا حقیقی وارث ہے۔

میں سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔

میرے سوتیلے عزیز تاریخ کو جتنا مسخ کر لیں مگر وہ میرے باپ کا نام کیوں کر مٹا سکیں گے۔کہ پھر وہ خود بھی بے شناخت ہو جائیں گے۔

میں ابراہیم کا بیٹا ہوں۔

میں ابراہیم کا پوتا ہوں۔

میں آل ابراہیم سے ہوں۔

آگ ابراہیم کے لئے گلزار ہو گئی تھی تو مجھے کیونکر نقصان پہنچا سکے گی۔

’’آگ سے ہمیں مت ڈراؤ یہ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی بھی غلام ہے۔‘‘

یہ آسمانی آواز مجھے یقین دلاتی ہے کہ میری ایڑیوں کی رگڑ سے ایک چشمہ پھوٹ بہے گا اور اس کا پانی میری مدد کو آئے گا۔

مجھے جس اندھے کنوئیں میں گرایا گیا تھا آسمان سے اس میں اتنا پانی اترے گا کہ وہ کنواں چھلک پڑے گا اور بحرِ ہند کا ٹھاٹھیں مارتا پانی سیلاب بن جائے گا۔

اور پھر سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کے ایندھن میں بھڑکائی ہوئی نفرتوں کی ساری آگ بجھ جائے گی۔

☆☆

میرے سوتیلے عزیزوں نے نفرت کی آگ لگا دی ہے۔اس آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔میرے چاروں طرف آگ پھیلی ہوئی ہے۔۔۔سوتیلے جذبوں کی آگ.....مگر میں دیکھتا ہوں کہ:

میرے بن باس کے دن ختم ہو چکے ہیں۔میرا حق میرا تخت مجھے مل گیا ہے اور میری بیوی کی پاک دامنی کی شہادت خود تاریخ دے رہی ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ:

میری قید کی مدت ختم ہو گئی ہے۔اور میں ایک اعلیٰ منصب پر سرفراز کیا گیا ہوں۔اور چاند سورج اور ستارے میرے حضور سجدہ ریز ہیں۔

اور میں دیکھتا ہوں کہ:

تپتے ہوئے صحرا میں میرے ایڑیاں رگڑنے سے ایک چشمہ پھوٹ بہا ہے۔مری ماں کے چہرے پر خوشیوں اور مسرتوں کا نور پھیلا ہوا ہے۔ وہ جو کسی قافلے کی امداد کی منتظر تھی اب ہزاروں قافلے اس کی مدد کے محتاج ہیں۔اور اس بادشاہ زادی کو ایک نئی بادشاہت مل گئی ہے۔اور ہزاروں برس سے میرا انتظار کرنے والی کنواریاں،میرے گلے میں ڈالنے کے لئے اپنے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار سجائے میری آمد کے گیت گا رہی ہیں۔

اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ بحرِ ہند کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی،آسمان سے اندھے کنوئیں میں اتر کر اور پھر باہر چھلک جانے والا پانی اور میری ایڑیوں کی رگڑ سے پھوٹ بہنے والے چشمے کا پانی.....سب میری آنکھوں میں اتر آئے ہیں۔

سوتیلے جذبوں سے بھڑکائی ہوئی نفرتوں کی آگ بجھتی جا رہی ہے اور اس آگ کے دوسری طرف میرے تمام سوتیلے عزیز حیرت اور خوف سے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔

میں آگ کے مکمل طور پر بجھنے کا انتظار کرتا ہوں۔

میں انتظار کرتا ہوں جب تھوڑی دیر بعد میرے سارے سوتیلے عزیز مجرموں کی طرح میرے سامنے پیش ہوں گے۔

اور میں اس وقت کے آنے سے پہلے ہی اپنا فیصلہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔

" لا تثریب علیکم الیوم.....''☆

☆ترجمہ: آج کے دن تم سے کوئی مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔

☆☆☆

یہ افسانہ ابو کے افسانوں کے مجموعہ ''روشنی کی بشارت'' سے لیا گیا ہے

افسانہ

روشنی کی بشارت

بدل جاتے ہیں اک لمحے میں ہی تاریخ کے دھارے
کبھی جو موج میں آکر قلندر بول اُٹھتے ہیں

''دیوانہ خاموش ہوگیا اور اپنے سامعین کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی خاموش تھے اور حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بالآخر اس نے چراغ زمین پر پٹخ دیا جو ریزے ریزے ہو کر بجھ گیا۔ تب اس نے کہا:

''میں بہت پہلے آ گیا ہوں میرا تعلق مستقبل سے ہے۔ یہ مہیب واقعہ ابھی فاصلے ہی طے کر رہا ہے'' **(نطشے کی ایک تمثیل سے اقتباس)**

اپنی آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں کا گواہ، مٹی کا چراغ اپنے ہاتھوں پر اٹھائے جب میں شہر کے لوگوں کو روشنی کی بشارت دیتا ہوں تو وہ مجھے اس انداز سے دیکھتے ہیں جیسے میں ان کے ساتھ مذاق کر رہا ہوں۔ کچھ لوگ میری بات پر ہنستے ہیں۔ کچھ سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے آگے چلے جاتے ہیں۔ کچھ سر اٹھا کر دیکھے بغیر کچھ سوچتے چلے جاتے ہیں۔

میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں کا گواہ مٹی کا چراغ میرے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن کوئی بھی میری بشارت پر ایمان نہیں لا رہا۔ مجھے شک گزرتا ہے۔ میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آ گیا ہوں۔ یہ لوگ مجھ سے سولہ سو برس پیچھے ہیں۔ یہ میری بات نہیں سمجھ پائیں گے۔ پھر کچھ سوچ کر میں اپنی ماں کے پاس جاتا ہوں اور روشنی کی بشارت دیتے ہوئے اسے بتاتا ہوں کہ میری آنکھوں میں سورج طلوع ہو رہے ہیں اور میرے ہاتھوں میں مٹی کا یہ چراغ ان کا گواہ ہے۔ میری

ماں مجھے تشویشناک نظروں سے دیکھتی ہے اور آسمانی صحیفوں کی دعائیں پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونکوں سے دَم کرنے لگتی ہے۔ میری چھوٹی بہن مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھتی ہے اور دبک کر ماں کے قریب ہو جاتی ہے۔ ماں کی سادگی اور بہن کے بھولپن پر افسردہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے میں مبارکہ کے پاس آتا ہوں اور اسے بتاتا ہوں کہ میں دنیا کو روشنی کی بشارت دینے کے لئے مامور کیا گیا ہوں۔ میری آنکھوں میں سورج طلوع ہو رہے ہیں اور میرے ہاتھوں میں مٹی کا یہ چراغ ان کا گواہ ہے۔ مگر وہ میری بات پر توجہ دینے کی بجائے مجھے دوکانداروں کے بلوں اور بچوں کی فیسوں کے بارے میں بتانے لگتی ہے۔ میں مایوس ہو کر عفت کے پاس چلا آتا ہوں۔ پہلے تو وہ میری بات پر توجہ نہیں کرتی لیکن جب میں پوری سنجیدگی سے اپنی بات دہراتے ہوئے اصرار کرتا ہوں کہ اب روشنی صرف میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں سے ہی اترے گی۔ تو وہ میرے قریب آ جاتی ہے۔۔ میرے ہاتھوں میں مٹی کے چراغ کو چھو کر دیکھتی ہے اور پھر پوچھتی ہے۔ کہیں آپ افسانہ لکھنے کے موڈ میں تو نہیں ہیں؟۔ میں اسے یقین دلاتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔ اس کے باوجود وہ مجھے اسی موضوع پر افسانہ لکھنے کی تحریک کرتی ہے۔

مجھے اب پوری طرح یقین ہو جاتا ہے کہ میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آ گیا ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے اس سے پہلے ایک دفعہ میں اپنے وقت سے پچاس برس پہلے آیا تھا اور جب پچاس برس بعد میں دوبارہ آیا تھا تو میں نے یہ دیکھا تھا کہ میں اپنے وقت سے ایک صدی پہلے آ گیا ہوں.... پھر جب میں ایک صدی بعد آیا تو میری آمد اپنے وقت سے دو سو سال پہلے تھی۔ اور جب میں دو سو سال بعد آیا تو میری آمد میں چار سو سال رہتے تھے اور پھر جب میں چار سو سال بعد آیا تو میں اپنے وقت سے آٹھ سو سال پہلے آیا ہوا تھا۔ اور اب جب میں آٹھ سو سال بعد آیا ہوں تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں اپنے وقت سے سولہ سو سال پہلے آ گیا ہوں۔

میں جو روشنی کی بشارت ہوں۔ ہر لحظہ اس دنیا سے دور ہو رہا ہوں وہ کون سی صفر مدّت ہے۔ جس میں یہ تمام صدیاں اور زمانے سمٹ آئیں گے اور میری آمد قبل از وقت نہ ہو گی۔ وہ صفر مدّت جب انسان نور کا انکار کر کے آگ کی بھینٹ نہیں چڑھے گا۔ مجھے اس مدّت کا انتظار

کرنا ہوگا۔

اب جب میں سولہ سو برس کے بعد آؤں گا تو میری آمد میں بتیس سو سال رہتے ہوں گے۔ اور جب میں بتیس سو سال بعد آؤں گا تو میری آمد میں چونسٹھ سو سال رہتے ہوں گے۔ اور اسی طرح کئی ہزار برس بیت جائیں گے۔ لیکن وہ صفر مدت کب آئے گی جب میرا آنا بروقت ہوگا۔ اور جب میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورج سوا نیزے کی اَنی پر آ جائیں گے۔ تب کوئی انکار کی جرأت نہ کر سکے گا۔ میں اپنے گزرے ہوئے اور آنے والے برسوں کا بوجھ اپنی روح پر اٹھائے پھر شہر میں آتا ہوں۔ شہر کے سب سے بڑے بازار میں پہنچ کر میں اعلان کرتا ہوں:

''لوگو! تم نے میری بشارت پر ایمان نہ لا کر خود کو روشنی سے محروم کر لیا ہے...''

میرا اعلان مکمل ہونے سے پہلے ہی لوگ تمسخر شروع کر دیتے ہیں۔ مختلف سمتوں سے گالیاں اور تضحیک آمیز فقرے میری طرف آ رہے ہیں۔ میں کمال ضبط سے تمام تمسخرانہ اور تضحیک آمیز فقرے برداشت کرتا ہوں۔ جب لوگ فقرے بازی سے خود ہی تھک جاتے ہیں تو میں اپنا پہلا اعلان ادھورا چھوڑ کر نیا اعلان کرتا ہوں:

''لوگو! تم نے روشنی کی تحقیر کی ہے۔ نورِ بصیرت سے محروم لوگو! تم میں سے اب صرف وہی لوگ بچائے جائیں گے جو میرے گھر کی دیواروں کی اوٹ میں پناہ لیں گے۔ میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آ گیا ہوں لیکن آگ تمہارا مقدر ہو چکی ہے۔''

یہ کہہ کر میں اپنا چراغ شہر کے چوراہے پر توڑ دیتا ہوں اور خود تیزی سے اپنے گھر کی طرف چلا آتا ہوں۔ لوگوں کے قہقہے گھر تک میرا تعاقب کرتے ہیں۔ لیکن میرے گھر پہنچنے تک وہ قہقہے چیخوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ مٹی کے اس چراغ سے سارے شہر میں آگ لگ جاتی ہے۔

میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ جاتا ہوں۔

سارے شہر میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ اور لوگوں کی چیخیں ایک بھیانک شور میں تبدیل ہو گئی ہیں میری ماں حیرت سے کبھی میرے کمرے میں آ کر مجھے دیکھتی ہے اور کبھی گھر کے صحن میں جا کر دھڑا دھڑ جلتے ہوئے شہر سے اٹھتے ہوئے شعلوں کو دیکھتی ہے۔ میری چھوٹی بہن

اسی طرح خوفزدہ انداز میں ماں کے ساتھ ساتھ ہے۔ پھر وہ ماں کو کھینچ کر میرے کمرے میں بٹھالیتی ہےاورخود دبک کر ماں کےاوربھی قریب ہوجاتی ہے۔

مبارکہ اورعفت دونوں میرے کمرے میں آتی ہیں۔ دونوں کے چہروں سے حیرت جھلک رہی ہے۔ایک گھمبیر خاموشی کے بعد مبارکہ ہمت کرکے بولتی ہے،

’’باہر بہت سارے لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے آئے ہوئے ہیں‘‘

’’اب ان کا ایمان لانا یا نہ لانا ایک برابر ہے...جولوگ دیواروں کی اوٹ میں ہیں انہیں ویسے بھی کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ میں اب بیعت نہیں لے سکتا۔ میں اب سولہ سو برس کے بعد آؤں گا۔ پھر بتیس سو برس کے بعد پھر چونسٹھ سو برس کے بعد۔۔پھر۔۔‘‘

مبارکہ اورعفت کے چہروں سے عقیدت کے ساتھ دہشت بھی ٹپکنے لگتی ہے۔

میری چھوٹی بہن دبک کر ماں کے کچھ اورقریب ہوجاتی ہے۔

میری ماں اپنی خالی آنکھوں میں ان لمحوں کو اتارنے کی کوشش کررہی ہے جب اس نے مجھے جنم دیا تھااور میں اس صفر مدت کا انتظار کرنے لگتا ہوں جب میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورج سوا نیزے کی اَنی پر اتر آئیں گے۔ جب وہ اپنے گواہ آپ ہوں گے اور جب مٹی کا کوئی چراغ گواہی کے لئے نہیں لانا ہوگا۔

☆☆☆

میری ماں اور چھوٹی بہن سامنے بینچ پر بیٹھے ہیں۔مبارکہ میری نبض دیکھتے ہوئے بتاتی ہے:

’’ابھی تھوڑی دیر پہلے عفت آپ کی عیادت کے لئے آئی تھی۔مگر آپ سوئے ہوئے تھے۔اب وہ پھر تھوڑی دیر بعد آئے گی۔‘‘

اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ میں کس صفر مدت کا انتظار کررہا ہوں!

☆☆☆

یہ افسانہ ابو کے افسانوں کے مجموعہ’’روشنی کی بشارت‘‘ سے لیا گیا ہے

چند افسانے

جن میں جزوی طور پر مذکور، بیوی کے حوالے سے امی کا ہی ذکر ہے

١۔آپ بیتی

٢۔گھٹن کا احساس

٣۔٥٠۔٢٧ سال بعد

٤۔بھید

٥۔اپنے وقت سے تھوڑا پہلے

٦۔افسانہ **مامتا** امی کے بچپن اورشادی کے بعد کے ایام کی کہانی ہے۔جس میں امی کی ذاتی زندگی کے ایک پہلو کو نفسیاتی طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔

''سوئے حجاز'' میں ذکر

۱۹۹۱ء کے وسط میں مبارکہ اور ہمارے تین بچوں رضوانہ، ٹیپو، مانو کا جرمنی پہنچ جانا ہم سب کے لئے بیک وقت خوشی اور پریشانی کا موجب تھا۔ خوشی اس لیے کہ یورپ کے دروازے ہمارے خاندان کے لئے کھُل رہے تھے، پریشانی اس لئے کہ میں اور دونوں بڑے بیٹے شعیب اور عثمان، ہم تینوں پاکستان میں تھے۔ ظاہری حالات کے لحاظ سے ہمارے جرمنی پہنچنے کا ابھی کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یوں گویا ہمارے خاندان کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا خطرہ موجود تھا۔لیکن پھر خدا نے کرم کیا۔ ایک طوفانی لہر آئی.....ہم تینوں باپ، بیٹے اس طوفانی لہر میں بالکل بے دست و پا تھے۔ اور پھر یوں ہوا کہ طوفان کی زد میں آئے ہوئے باپ بیٹوں کا سہارا ان کا خدا بن گیا۔ دنیا والوں کے دیکھتے ہی دیکھتے ہم بے آسرا لوگ یونائیٹڈ نیشنز کے ادارہ برائے مہاجرین کے اس شعبہ کے تحت جرمنی پہنچ گئے جو بچھڑے ہوئے خاندانوں کو ملاتا ہے۔ جو لوگ تین تین لاکھ روپے ایجنٹوں کو دے کر چوری چھپے جرمنی پہنچے تھے اور یہاں سیٹ ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ یہ تین افراد اس شان سے جرمنی پہنچے ہیں کہ ان کے لئے ٹکٹ UNHCR نے فراہم کیا، ویزہ خود جرمن حکام نے دیا اور فرینکفرٹ ایئرپورٹ پر یونائیٹڈ نیشنز کی ایک نمائندہ نے آکر انہیں ریسیو کیا۔

جو کوں راکھے سائیاں مار سکے نہ کوئی

-------------- جرمنی پہنچنے کے بعد نہ صرف مجھے خدا کے فضل و کرم سے قانونی تحفظات مل گئے بلکہ میرے کیس کی بنیاد پر مبارکہ اور بچوں کا کیس بھی منظور کر لیا گیا جو تین برسوں سے لٹکا ہوا تھا۔ ان تحفظات کے علاوہ بھی خدا کے فضل اور احسانات کی ایک پھوار تھی (اور اب بھی ہے) جس نے ہماری زندگی کے صحرا کو سیراب کر دیا تھا۔ ان سارے احسانات کی شکر

گزاری کے لئے میرے اور مبارکہ کے درمیان طے ہوا تھا کہ ہم دونوں مکہ شریف اور مدینہ شریف جائیں گے۔ عمرے کی سعادت حاصل کریں گے، مقامات مقدّسہ کی زیارت کریں گے۔ دسمبر ۱۹۹۵ء میں جانے کا ارادہ تھا لیکن اس سے دو ماہ پہلے میرے چھوٹے بھائی اعجاز نے ایک بھاری رقم بطور قرض مانگ لی۔ میں شش و پنج میں تھا، مبارکہ نے کہا ہماری عمرہ کرنے کی نیت پکی تھی۔ خدا نیتوں کا حال جانتا ہے۔ آپ اپنے چھوٹے بھائی کی ضرورت پوری کر دیں۔ خدا کو ہماری نیکی پسند آ گئی تو اس سال نہ ہو سکنے والے عمرہ کو بھی قبول فرما لے گا اور اگلے برس سچ مچ عمرہ کے لئے جانے کے وسائل بھی عطا کر دے گا اور جانے کی توفیق بھی بخش دے گا۔ چنانچہ میں نے مبارکہ کے کہنے پر عمل کیا اور اسکی نیت کے مطابق دسمبر ۱۹۹۶ء میں ہمیں عمرہ پر جانے کی سعادت نصیب ہو گئی۔

---------- سفارت خانے میں ویزہ کے حصول کے لئے جب کاغذات جمع کرائے تو ایک دو اڑچنیں بیچ میں آ گئیں۔ جرمنی میں ہر انسان کی نجی زندگی کا احترام کیا جاتا ہے۔ پاسپورٹ پر نہ تو کسی کی ولدیت لکھی جاتی ہے اور نہ مذہب کا کوئی خانہ ہوتا ہے۔ میاں بیوی کے پاسپورٹوں پر ایک دوسرے کا نام اسی صورت میں لکھا جاتا ہے جب دونوں کے کیس منظور شدہ ہوں۔ میرا پاسپورٹ جب بنا تھا تب مبارکہ کا کیس منظور نہیں ہوا تھا اس لئے میرے پاسپورٹ پر اس کا نام درج نہیں ہو سکا۔ جب مبارکہ کا کیس منظور ہو گیا تب اس کے پاسپورٹ میں اتفاقاً میرا نام درج ہونے سے رہ گیا۔ ہمارے لئے یہ کوئی اہم مسئلہ بھی نہیں تھا....لیکن اب سفارت خانہ سعودی عرب والوں کا مسئلہ یہ تھا کہ ہم دونوں کو میاں بیوی کیسے مانا جائے۔ ہمارا نکاح فارم تو ۱۹۷۳ء میں خانپور میں آنے والے قیامت خیز سیلاب میں بہہ گیا تھا اور نکاح نامہ کا ثبوت تو میں یو۔این۔او والوں کو بھی فراہم نہیں کر سکا تھا۔ پاسپورٹ پر بے شک اندراج نہیں تھا لیکن جرمن حکام نے ہمیں میاں بیوی مان لیا تھا۔ سعودی سفارت خانہ والوں سے میں نے کہا کہ ہمارے پانچ بچے ہیں اور اب وہی ہمارا نکاح نامہ ہیں۔ کہنے لگے چلیں ان بچوں کے کاغذات دکھا دیں۔ میں نے کہا اگر مجھے اس الجھن کا علم ہوتا تو پانچوں بچوں سمیت کاغذات لے کر آتا۔ میرا خیال ہے میرے لب و لہجے سے

انہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہم میاں بیوی ہیں وگرنہ اتنا بڑا مسئلہ اتنی آسانی سے حل نہ ہوتا۔سفارت خانہ کے متعلقہ افسر نے کہا دوپہر دو بجے کے بعد آکر ویزہ لے جائیں۔سو ہم اطمینان سے بون شہر میں گھومنے پھرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔پہلے رائن دریا کے اِدھر والے کنارے پر گئے۔وہاں سے حدِ نگاہ تک آنے والے سارے مناظر کو زاویے بدل بدل کر دیکھا،وہیں ''ناشتہ کم لنچ'' کیا۔اس کے بعد مارکیٹوں کے چکر لگانے لگے۔تھوڑی بہت خریداری کر لی۔ڈیڑھ بجے تک ہم لوگ واپس سعودی سفارت خانے پہنچے۔پونے دو بجے متعلقہ آفس سے رجوع کیا۔مقررہ وقت دو بجے سے پہلے ہی ہمیں ویزہ مل گیا۔خدا کا شکر ادا کیا اور خوشی خوشی گھر لوٹ آئے۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جہاز اُڑنے لگا تو دل کی عجیب سی حالت ہوگئی۔ہوائی سفر کی وجہ سے نہیں بلکہ سفر کے رُخ کی وجہ سے۔پھر جب (غالبًا) پائلٹ نے اُڑان بھرنے کے ساتھ ہی دعاء السفر پڑھنی شروع کی تو اسپیکر سے نشر ہوتی ہوئی اس دعا کے الفاظ نے ایسا اثر کیا کہ مجھے لگا میری روح جسم سے الگ ہو کر مگر میرے ساتھ ساتھ پرواز کر رہی ہے۔مجھ جیسا گناہ گار ربِ کعبہ کے گھر حاضری دینے جا رہا تھا۔کہاں میں کہاں وہ مقام اللہ اللہ! بے اختیار ہونٹوں سے تسبیح و تحمید ہونے لگی...... یہ کیفیت اس وقت ٹوٹی جب مبارکہ نے بتایا کہ اس کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔اصل میں حرمین شریفین جانے کی خوشی میں مبارکہ نے صبح کا ناشتہ نہیں کیا تھا۔ایئرپورٹ تک پہنچنے کے چکر میں دوپہر کا کھانا بھی رہ گیا تھا اور اب اسے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ائیر ہوسٹس کو بلا کر اس صورتحال سے آگاہ کیا۔اس نے کہا اگر گھبراہٹ زیادہ ہے تو فوری طور پر کوئی جوس لا دیتی ہوں ورنہ آدھے گھنٹہ تک کھانا لے آتی ہوں۔سو پہلے جوس آ گیا۔پھر کھانا...اور مبارکہ کی طبیعت بہتر ہونے لگی۔

سوئے حجاز۔''ارادے سے روانگی تک''،سے اقتباس

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

طواف اور سعی سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مبارکہ کو بتایا کہ حطیم میں ہم پہلے بھی نوافل ادا کر چکے ہیں لیکن آج ہم ایک سنّت پر عمل کرنے کا ثواب بھی حاصل کریں گے پھر میں نے اسے

بتایا کہ ایک بار حضرت عائشہؓ نے حضور ﷺ کی خدمت میں خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ خانہ کعبہ کے اندر نماز پڑھنا چاہتی ہیں تب حضور ﷺ نے حضرت عائشہ ؓ کا ہاتھ پکڑا اور انہیں حطیم میں لاتے ہوئے ارشاد فرمایا یہاں نماز پڑھ لیں کیونکہ حطیم بھی کعبہ کا حصہ ہے۔یہ بات کہہ کر حضورؐ نے پھر ارشاد فرمایا: نیا نیا ایمان لانے کے باعث اگر مجھے اپنی قوم کے ابتلا کا ڈر نہ ہوتا تو میں کعبہ کی عمارت کو گرا کے پھر سے ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کراتا۔یہ بتا کر میں نے سنتِ رسولؐ کی پیروی میں مبارکہ کا ہاتھ پکڑا اور اسی طرح اسے لے کر حطیم میں داخل ہوا۔یہاں ہم نے نوافل ادا کئے۔خدا کے احسانات کی شکر گذاری کی، دلی دعائیں کیں حطیم والی طرف خانہ کعبہ کی جو دیوار ہے اس سے بہت سارے لوگ چمٹے ہوئے تھے۔یکا یک مجھ پر منکشف ہوا کہ۔۔۔یہ سامنے والی دیوار تو صرف ظاہری پردہ ہے وگرنہ میں جو حطیم میں بیٹھا ہوا ہوں

درحقیقت خانہ کعبہ کے اندر ہی بیٹھا ہوا ہوں۔عجیب لذّت آفریں اسرار تھا کہ میں بیک وقت کعبہ کے اندر بھی تھا اور باہر بھی۔یہ داخلیت اور خارجیت کی بحث تو بس ایسے ہی ہے۔اس انوکھے تجربے نے مجھے احساس دلایا کہ ہمارا باہر بھی ہمارے اندر کا ایک حصہ ہے۔لیکن پھر اسی بھید کا ایک اور مرحلہ بھی مجھ پر منکشف ہوا۔

ظاہر،باطن عین ایانی،ہُو ہُو پیا سینوے ہُو

سلطان باہو کے اس عارفانہ تجربے جیسی ہی کوئی بات تھی لیکن میرے لئے ناقابلِ بیان ہے۔

حطیم سے باہر آئے تو اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے مبارکہ نے کہا حضرت عائشہؓ کی حطیم میں نماز پڑھنے والی روایت سے مجھے یاد آیا ہے کہ جب حجاج بن یوسف نے کعبہ کی ابراہیمی بنیادوں والی عمارت کو گرا کر اسے پھر موجودہ بنیادوں پر تعمیر کرا دیا تب کسی نے حجاج کو اس روایت سے آگاہ کیا۔تب حجاج بن یوسف نے افسوس کیا اور کہا کہ مجھے پہلے سے اس کا علم ہوتا تو عبداللہ بن زبیرؓ کی تعمیر کرائی ہوئی ابراہیمی بنیادوں کو ہرگز نہیں چھیڑتا، ویسے ہی رہنے دیتا۔مبارکہ کی اس بات کے جواب میں تب میں نے کہا کہ حجاج بن یوسف کے سامنے مسئلہ ابراہیمی بنیادوں کا تھا ہی نہیں۔ان کے سامنے تو مسئلہ یہ تھا کہ وہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے لئے کوئی

یادگار کریڈٹ رہنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ان کا مسئلہ ان کے اپنے اقتدار کے استحکام کا تھا۔اگر حجاج بن یوسف کو حضورؐ کی روایت کا اتنا ہی پاس تھا تو ایک بار عمارت گرانے کے بعد دوسری بار بھی گرا کر ابراہیمی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کرا لینے میں کیا پریشانی تھی؟.....یہ میرے ذہن تاثر تھا لیکن میرا دل مجھے کہہ رہا تھا کہ حجاج کی نیت کا معاملہ خدا پر چھوڑو۔یہ دیکھو کہ اگر حجاج نے ایسا نہ کیا ہوتا تو تم نے کعبہ کے باہر بیٹھ کر کعبہ کے اندر بیٹھنے کا روحانی تجربہ کیسے کیا ہوتا!

سوئے حجاز۔’’تیسرا عمرہ‘‘،سے اقتباس

جنت المعلیٰ کے کھلے میدان میں (اسے قبرستان کی جگہ اب میدان ہی کہنا چاہیے) میں نے کھڑے ہو کر سارے بزرگوں کے لئے دعا کی اور باہر نکل آیا۔یہاں خواتین کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔صرف طوافِ کعبہ اور سعی کے دوران عورتیں اور مرد یک جا ہوتے ہیں۔تب روحانیت کے ساتھ انسانیت بھی معراج پر ہوتی ہے۔کوئی فرقِ من و تو نہیں ہوتا۔لیکن جیسے ہی نماز کی اذان ہوتی ہے پُلسیئے خواتین کو الگ سائڈ پر ہانکنا شروع کر دیتے ہیں۔میں قبرستان سے باہر آیا تو مبارکہ مغموم سی کھڑی تھی۔میں نے اسے دلاسہ دیا اور بتایا کہ میں اندر کا حال دیکھ کر زیادہ مغموم ہوا ہوں۔

سوئے حجاز۔’’مکہ کے تاریخی مقدس مقامات‘‘،سے اقتباس

...کعبہ کا الوداعی دیدار کیا اور پھر اپنے ہوٹل میں چلے گئے۔وہاں جا کر مبارکہ نے امانت خانے سے سامان نکلوایا اور میں ٹیکسی والے کو لے آیا....اب ہم جدّہ کی طرف جا رہے تھے۔رات پونے دس بجے تک ہم جدہ ائیر پورٹ پر پہنچ گئے۔۱۰بجے تک سامان بُک کرا دیا۔ہماری فلائیٹ رات ایک بجے کی تھی۔سو گذرے ہوئے بابرکت دنوں کو اور ان دنوں کے مناظر اور واقعات کو یاد کرنے لگے....ایسے واقعات جو ہو کر گذر بھی چکے تھے لیکن جدہ ائیر پورٹ پر ہی خواب جیسے لگنے لگے تھے۔

جہاز اڑنے لگا تو مبارکہ کی طبیعت پھر بگڑنے لگی۔پچھلی بار تو بھوک لگنے کا مسئلہ تھا لیکن اس بار تو بھوک بالکل ہی نہیں تھی۔مبارکہ نے ’’السعودیہ‘‘ والوں کا کھانا بھی نہیں کھایا۔صرف جوس پر گذارا کیا۔جہاز میں بہت سارے گورے سوار تھے۔یہ سب کے سب روم میں اترنے والے تھے۔۲۵ر دسمبر کو کرسمس منانے کے لئے ابھی سے ویٹی کن سٹی کے لئے جانا شروع ہو گئے تھے۔ ہمارا جہاز روم کے ایئرپورٹ پر ایک گھنٹے کے لئے رُکا اور پھر ہم فرینکفرٹ پہنچ گئے۔ایئرپورٹ کے مراحل سے گذر کر بخیر وخوبی باہر آئے۔ٹیکسی لی اور پندرہ منٹ کے بعد ہم اپنے گھر،اپنے بچوں کے پاس پہنچ گئے۔**فالحمدللہ علیٰ ذلک۔**

سوئے حجاز۔’’مکہ مکرمہ میں آخری دن اور جرمنی واپسی‘‘،سے اقتباس

حج کا سفر۔۔۔سال۲۰۰۳ء

۲رفروری اتوار کے روز ساڑھے نو بجے کی حج فلائیٹ سے روانہ ہوئے۔۳رفروری کو علی الصبح سعودی عرب کے وقت کے مطابق ۵ بجے جدہ پہنچے۔جدہ ائر پورٹ پر بد انتظامی کی انتہا تھی۔بے شک حج کے ایام میں رش بہت زیادہ ہو جانے کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور کہیں نہ کہیں کوئی انتظامی کوتاہی رہ جاتی ہے۔لیکن یہاں تو دیدہ دانستہ بدانتظامی کے مناظر تھے۔میں اس سفر کی روداد کے آخر میں سعودی انتظامیہ کے لئے ایک دو مشورے لکھوں گا۔اگر ان پر غور کر کے عملدرآمد کی کوئی صورت نکل آئے تو اچھی بات ہو گی۔

جدہ ائرپورٹ سے باہر نکلنے تک افراتفری،بدنظمی کے کئی مرحلوں سے گزرے۔باہر آئے تو ہمارا سامان ایک بڑے ٹرالے پر لاد کر کسی انجان سمت لے جایا جانے لگا۔پھر ایک ٹرمینل پر لے جا کر سارا سامان ڈھیر کر دیا گیا۔دراصل حج کے سلسلہ میں سعودی حکومت نے گروپ کی صورت میں آنے والوں کو ترجیح دے رکھی ہے جو حکومت کے لئے خاصا منفعت بخش کاروبار بن چکا ہے۔انفرادی اور ذاتی طور پر آنے والوں کی حوصلہ شکنی کا بطور خاص انتظام کر رکھا ہے تاکہ

لوگ صرف حج گروپس کی صورت میں آئیں اور سعودی حکومت کے خزانے میں اضافہ کا موجب بنیں۔آگے چل کر پوری طرح اس بات کی تصدیق ہوتی گئی کہ ایک دینی فریضہ کی ادائیگی کو ’’خادمین الحرمین الشریفین‘‘ کی قائم کردہ وزارت حج کی جانب سے باقاعدہ کمرشیلائز کر دیا گیا ہے۔-------------

وہاں سے واپس اس ٹرمینل تک آئے جہاں ہمارا سب کا سامان ڈھیر تھا،تو دیکھا کہ مبارکہ اکیلی کھڑی رو رہی ہے۔سارا سامان غائب ہے۔پتہ چلا کہ وہ ٹرمینل کے ساتھ منسلک باتھ روم تک گئی ہے اور تین منٹ کے اندر سارا سامان غائب ہو گیا ہے۔وہاں گروپ حج والے بھی موجود تھے۔وہ جانے لگے تو ان کے سامان کے ساتھ ہمارا سامان بھی چلا گیا۔یہ گروپ والوں میں سے کسی کی بد نیتی تھی یا سعودی انتظامیہ کی بد انتظامی تھی،خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

دو بھرے ہوئے اٹیچی کیس اور ایک بڑا بیگ، لے جانے والے سب کچھ ہی لے گئے۔اب فہد عمرہ سروس والوں کی سروس کا کیا کرتے،سامان کی فکر دامنگیر ہوئی۔تشویش والی سب سے اہم بات یہ تھی کہ بلڈ پریشر اور شوگر چیک کرنے والے ہمارے سارے آلات بھی اس سامان میں تھے اور ہماری بیماریوں کی دوائیں بھی اس سامان میں تھیں۔میرا مسئلہ شوگر کی ایک گولی تک تھا لیکن مبارکہ کو بیک وقت سات آٹھ گولیاں دن میں دو تین بار لینا ہوتی ہیں۔اور ہر گولی بہت ضروری ہوتی ہے۔سارا سامان غائب ہونے کے باوجود یہ بھی خدا کا شکر ہے کہ مبارکہ کا پرس اس کے کندھوں پر تھا۔پرس میں ہماری ساری سفری دستاویزات اور ایک معقول رقم موجود تھی۔اسی لئے مجھے سامان کی اتنی فکر نہیں تھی البتہ دواؤں کے سلسلے میں پریشانی ضرور تھی کہ کیا بنے گا۔

سوئے حجاز۔سفرِ حج سے اقتباس

صبح پانچ بجے جدہ ائر پورٹ پر پہنچنے کے بعد سے لے کر اگلے پندرہ گھنٹے تک ہم مسلسل ائر پورٹ پر خوار ہوتے رہے۔اس خواری کی وجہ یہی تھی کہ ہم حج گروپ کے ساتھ نہیں تھے اور ذاتی طور پر

آنے والوں کو جان بوجھ کر خوار کیا جا رہا تھا۔ہر طرف سے پریشانیوں کا سامنا کرنے کے بعد آخر بغیر سامان کے مکہ میں اپنے مقررہ ہوٹل تک پہنچے۔پندرہ گھنٹے سے زائد کی پریشانی،تھکن اور کوفت کے باوجود ہوٹل میں اپنا کمرہ سنبھالنے کے بعد سیدھا خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے حرم شریف روانہ ہو گئے۔حرم شریف پر نظر پڑتے ہی ایسے لگا جیسے ساری تکالیف کی قیمت وصول ہو گئی ہو۔

۴؍فروری (۳ ذی الحجہ) کو ہم نے فجر کی نماز کے بعد پہلے ناشتہ کیا۔پھر ہوٹل میں جا کر آرام کیا۔ظہر کی نماز حرم شریف میں ادا کی۔پھر کچھ خریداری کرنے نکلے۔وہاں پاکستانی طرز کے لباس نہیں مل رہے تھے۔مجبوراً عربی ملبوسات پر گزارا کرنا پڑا۔واپس آ کر جب ہم دونوں نے عربی لباس پہن کر انہیں چیک کرنا چاہا تو عربی لباس میں ملبوس ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔میں تو ہنستا ہی رہا لیکن ہنستے ہنستے مبارکہ کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔اسے سامان کی گمشدگی کا بہت دکھ تھا۔میں نے اسے تسلی دی کہ پرانے زمانے میں لوگ بہت تکالیف اور دکھ اٹھا کر مکہ پہنچ پاتے تھے۔سو طرح کی بیماریوں سے گزرتے ہوئے،دوران سفر ہی ان کے قافلے کئی مصائب میں مبتلا ہوتے۔خود عرب بدو ان کے قافلوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ہم ہوائی جہاز سے بڑے آرام سے آئے ہیں۔صرف سامان غائب ہوا ہے تو یہی سمجھ لیں کسی عرب بدو نے لوٹ لیا ہے۔اگر وہ سارا سامان موجود ہوتا لیکن صرف آپ کا پرس گم ہو جاتا تو ہم کتنی بری حالت میں ہوتے؟اس پرس میں اتنی رقم ہے کہ ہم ویسے ہی تین بیگ اور ویسے ہی سامان سے دوگنا سامان آسانی سے خرید سکتے ہیں۔

۴؍فروری کو خانہ کعبہ کی زیارت کی تو منظر بہت بدلا بدلا سا لگا۔غلافِ کعبہ کو اس کے اصل مقام سے شاید اندازاً ڈیڑھ دو میٹر اونچا کر دیا گیا تھا اور اس کے نیچے سفید لٹھا قسم کا کپڑا اسلائی کر دیا گیا تھا۔یہ صورت دیکھ کر دل کو دھچکا سا لگا۔کعبہ شریف غلاف میں اس ردو بدل کے باعث پھیکا پھیکا سا لگ رہا تھا۔حطیم کی روشنی بھی بجھی بجھی سی تھی۔پتہ نہیں یہ عالمی صورتحال پر خانہ کعبہ کی اداسی کا منظر تھا یا ویسے ہی میرے اپنے اندر کی اداسی تھی۔ویسے یہ بات مجھے سمجھ آ گئی تھی کہ بہت زیادہ عقیدت مند حجاج،حج کے رش سے فائدہ اٹھا کر غلافِ کعبہ کے ٹکڑے قینچی سے کاٹ کر گھروں میں تبرک کے طور پر لے جاتے رہے

ہیں(چوری کیا ہوا تبرک؟)۔غالباً اسی وجہ سے حکومت نے حفاظتی تدبیر کے طور پر غلافِ کعبہ کو اونچا کر دیا تھا۔یہ مناسب تدبیر تھی لیکن اس تبدیلی سے یوں لگتا تھا جیسے دل اور کعبہ دونوں ہی اداس ہیں۔

مغرب کی نماز کے بعد ہم حرم شریف سے نکل کر اپنے ہوٹل کی طرف جانے لگے تو مسلسل بڑھتے ہوئے رش میں پھنس گئے۔حجاج کی آمد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا،سڑکوں پر کپڑا اچھا کر سامان بیچنے والے موجود،سڑک پر بے ترتیب ٹریفک کا ہجوم اور تنگ سڑکیں۔۔۔نماز کے بعد حرم شریف سے نکلنے والے حجاج کا ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ ہم دونوں اس میں پھنس کر رہ گئے۔میں مبارکہ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پیچھے سے ایک تیز ریلا آیا جس میں ہم دونوں تنکے کی طرح بہہ نکلے۔مبارکہ کی حالت اتنی غیر ہوگئی کہ شارع خالد بن ولید پر واقع ایک دوکان ''تسجیلات الاسلامیہ الخلفاء'' کے تھڑے پر کھڑے ایک صاحب نے پہلے مبارکہ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور پھر اسے کھینچ کر دوکان کے اندر کر لیا۔میری بھی جان میں جان آئی۔دوکان کے تھڑے پر چڑھے تو دیکھا وہاں پہلے سے ایسی چند اور خواتین بھی پناہ گزین تھیں اور بری طرح ہانپ رہی تھیں۔دراصل اس ایریا کا ہمارا سابقہ تجربہ عمرہ کے عام دنوں کا تھا،ہمیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ حج کے دنوں میں رش کی وجہ سے ایسی خوفناک صورتحال بھی پیش آسکتی تھی۔اس تجربہ کے بعد ہم نے یہ احتیاط شروع کر دی کہ نماز کے بعد لگ بھگ ایک گھنٹہ تک حرم شریف کے اندر ہی بیٹھے رہتے تاکہ رش کا زور ٹوٹ جائے۔

سوئے حجاز۔سفرِ حج سے اقتباس

رات بارہ بجے کے بعد ۹ **فروری** (۸ **ذی الحجہ**) کی تاریخ شروع ہو چکی تھی۔جب منیٰ کے لئے ہماری روانگی ہوئی۔منیٰ خیموں کا عالی شان شہر بنا ہوا تھا لیکن جاتے ہی پہلی خرابی یہ ہوئی کہ بس ڈرائیور نے ہمیں ہمارے کیمپ B-39 کی بجائے نمبر 39 پر اتار دیا۔ وہاں پھر پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔مبارکہ کی طبیعت بگڑنے لگی۔وہ تھک ہار کر سڑک کے کنارے

پر ہی بیٹھ گئی۔آخر ایک ویگن آئی اور ہمیں اصل ٹھکانے پر لے گئی۔بس میں بیٹھے ہوئے دور سے خیموں کو دیکھ کر مجھے لگا تھا کہ ان کے اندر مجھے گھٹن ہو سکتی ہے۔لیکن نہ صرف خیمے بے حد کشادہ تھے بلکہ ان کے اندر بڑے بڑے ائر کنڈیشنڈ لگے ہوئے تھے۔گھٹن کی بجائے سردی لگنے لگی۔خواتین کے خیمے الگ تھے اور مردوں کے الگ۔تاہم رابطہ کرنے میں زیادہ دقت نہیں تھی۔مبارکہ کو اتنی زیادہ ٹھنڈ لگ رہی تھی کہ اس کے کہنے پر میں نے خود اس کے خیمے میں جا کر اس کا ائر کنڈیشنڈ بند کیا۔پھر بھی صبح تک مبارکہ کی حالت کافی خراب ہو گئی۔چنانچہ ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔ایک ایمبولینس آئی۔وہیں پر مبارکہ کی دیکھ بھال کی گئی اور پھر وہ لوگ دوا دے کر رخصت ہوئے۔۹/فروری کا سارا دن منیٰ میں اپنے اپنے خیموں میں نمازیں،نوافل کی ادائیگی کرتے،تلاوت قرآن پاک کرتے اور دعائیں کرتے ہوئے گزارا۔

اگلے روز ۱۰/**فروری** (۹/**ذی الحجہ**) کو صبح سویرے ہی عرفات کے لئے روانگی ہوئی۔وقوف عرفات حج کا رکنِ اعظم ہے۔یہاں حج کا خطبہ ہوتا ہے اور مسجد نمرہ میں خطبہ عید ہوتا ہے اور اس سے ملحق بڑے میدان میں نماز باجماعت کے ساتھ اپنے اپنے گروپوں میں نماز با جماعت کا انتظام ہوتا ہے۔ہم نے اپنے ہی گروپ میں نماز باجماعت پڑھی۔(یہاں گروپ سے مراد صرف یہ ہے کہ ہم جس حصے میں مقیم تھے وہاں کے سارے لوگوں نے باجماعت نماز ادا کی)شام ہونے کے بعد یہاں سے مزدلفہ کے لئے روانگی ہوئی۔یہ ایک کھلا میدان ہے۔یہاں بے سروسامانی کی حالت میں کسی چھت کے بغیر اور مرد،عورت کی کسی تفریق کے بغیر جہاں جگہ ملے وہاں رہ کر پوری رات عبادت میں گزارنی ہوتی ہے۔لاکھوں لوگوں کا ہجوم یکجا ہوا تو گردوغبار بھی بہت زیادہ بڑھ گیا۔روایت ہے کہ مزدلفہ میں جو کوئی ساری رات جاگ کر دعا مانگتا رہے،اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔حقیقتاً دن بھر میدانِ عرفات میں عبادت کے بعد مزدلفہ پہنچنے تک ہی انسان اتنا تھک جاتا ہے کہ اس کا رات بھر جاگنا ہی مشکل ہو جاتا ہے اور پھر انہماک کے ساتھ دعا مانگنے کی کیفیت پیدا ہونا تو اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔شاید اسی لئے اسی موقعہ پر قبولیت دعا کا چانس زیادہ کر دیا گیا کہ مانگنے والوں کو اتنا ہوش ہی کہاں ہوگا۔مزدلفہ میں سب کچھ غیر منظّم

تھا۔کوئی سونا چاہے تو جیسے چاہے جہاں چاہے دستیاب صورتحال کے مطابق سوسکتا تھا۔محرم اور غیرمحرم کی کوئی تفریق نہ تھی۔بس کوئی اپنے طور پر احتیاط کرلے تو کرلے۔یہاں کے گرد وغبار کی وجہ سے مبارکہ کی حالت ایک دفعہ پھر بگڑ گئی۔لیکن اب صبر کے ساتھ تکلیف برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔خود مجھے بھی کھانسی کی تکلیف ہوگئی تھی اور کھانس کھانس کر براحال ہوگیا تھا۔یہیں سے میں نے منیٰ میں شیطان کو مارنے کے لئے اپنے اور مبارکہ کے حصے کی کنکریاں جمع کرلیں۔

۱۱؍**فروری** کو ہم لوگ گرتے پڑتے منیٰ میں اپنے خیموں تک پہنچے۔مبارکہ کی علالت کے باعث اسے اس کے خیمے میں چھوڑا اور خود شیطان کو کنکریاں مارنے کے لئے چلا گیا۔

سوئے حجاز۔سفرِ حج سے اقتباس

پہلے عمرہ میں، منیٰ جانے سے پہلے ،طواف کرتے ہوئے ہم گراؤنڈ فلور سے خانہ کعبہ کے گرد تین چکر لگا پائے تھے کہ ہجوم کی وجہ سے مجھے لگا مبارکہ اس میں کچلی جاسکتی ہے۔چنانچہ باقی کے چار چکر ہم نے دوسری منزل سے جا کر پورے کئے تھے۔اس بار پہلے ہی طے کرلیا تھا کہ طواف اور سعی کے سارے مراحل اوپر والی کسی منزل پر طے کریں گے۔

چنانچہ تیسری منزل سے ہم نے خانہ کعبہ کا طواف شروع کیا۔مبارکہ کے لئے وہیل چیئر کا انتظام کر لیا تھا۔یہ ایک چکر زمین سے خانہ کعبہ کے گرد تین چکروں کے برابر لگا لیکن رش کی موجودہ حالت میں یہی بہتر لگا۔طوافِ کعبہ کے بعد سعی کے چکر شروع ہوئے۔میں سعی کے دوسرے پھیرے میں تھا جب مبارکہ مجھے ملی اور بتایا کہ اس کا چھٹا چکر ہے۔ہم نے سعی کے بعد سعی کے اختتام والے دروازے پر ملنے کا طے کیا۔جب میں نے سعی کا عمل مکمل کیا اور سعی کے اختتام والے دروازے سے باہر گیا تو مبارکہ غائب۔۔۔

صبح سویرے منیٰ جانے سے لے کر موجودہ وقت تک میں مسلسل چلنے کے عالم میں تھا۔چلنا بھی ایسا جس میں زیادہ تر پریشانی اور بے یقینی ساتھ ساتھ تھی۔ساڑھے تین گھنٹوں میں طواف اور سعی کے مکمل ہونے والے عمل کے بعد اب ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا۔مبارکہ کو کہاں

تلاش کیا جائے؟ پہلے تو باہر والے دروازے کے آس پاس ڈھونڈتا رہا۔پھر طواف والے ایک کھلے حصے میں چلا گیا کہ وہاں عقب میں بچھی کھلی صفوں میں شاید کہیں مل جائے۔کبھی ادھر اور کبھی اُدھر۔۔۔۔لیجئے میری ذاتی سعی اب شروع ہوئی۔۔۔بی بی حاجرہ اپنے لختِ جگر کے لئے بے چینی سے دوڑ رہی تھیں تو میں اپنے لختانِ جگر کی والدہ محترمہ کے لئے پریشان ہوا پھر رہا تھا۔کبھی سعی کے اختتام والے دروازے کی طرف تو کبھی آغاز والی طرف۔۔کبھی بالکل باہر جا کر تو کبھی سعی یا طواف والے ہجوم میں جا کر۔کبھی کسی طرف اور کبھی کسی طرف کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کروں۔تیسری منزل پر موجود سرکاری اہلکاروں کو اپنی پریشانی بتائی ،وہ ویسے بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے اوپر سے ان کا حسبِ معمول نازیبا رویہ۔

ننگے پاؤں ہی حرم شریف سے باہر نکل آیا۔رستے میں ایک ہندستانی نوجوان مل گیا۔اس نے میری پریشانی جان کر پولیس اسٹیشن تک میری رہنمائی کی۔وہاں ترجمان کا فریضہ بھی ادا کیا۔لیکن جس پولیس نے جدہ سے لے کر منیٰ تک کسی مرحلے کی کسی پریشانی میں دھیلے کا تعاون نہیں کیا وہ اس صورتحال میں کیا مدد کرتے۔میں نے ان سے کہا کہ آپ حرم شریف کی تیسری منزل کے اہلکاروں کو موبائل پر یہ واقعہ بتا کر اتنا کہہ دیں کہ کوئی خاتون اس پریشانی میں ملیں تو آپ کو اطلاع کردیں۔لیکن پولیس اسٹیشن نے اس رنگ کا کوئی تعاون کرنے سے بھی انکار کیا۔

پولیس اسٹیشن سے مایوس ہو کر ہندوستانی دوست کا شکریہ ادا کیا اور حرم شریف کی طرف لوٹ آیا۔میری سعی گیارہ بج کر پچاس منٹ پر مکمل ہوئی تھی اور اب رات کے دو بج رہے تھے۔میں گراؤنڈ فلور پر خانہ کعبہ کے سامنے اس طرف کھڑا ہوگیا جہاں سے حطیم شریف، مقامِ ابراہیم اور حجرِاسود اور ملتزم شریف والے حصے میرے سامنے تھے۔ننگے پاؤں چل چل کر ویسے ہی مت ماری گئی تھی۔اس وقت دعا کے لئے الفاظ بھی نہیں سوجھ نہیں رہے تھے۔حج پر آنے سے پہلے مجھے بلھے شاہ کی ایک کافی ریاض قادری کی آواز میں دیکھنے اور سننے کا موقعہ ملا تھا۔مجھے اس کی پیش کش اور گانے کا انداز سب بہت اچھا لگا تھا۔نئی موسیقی کے اوچھے پن کی بجائے اس میں وہی پاکیزگی ملتی تھی جو بلھے شاہ کی کافی کا خاصہ ہے۔پتہ نہیں کیسے اس کافی کا ایک بند میرے ذہن میں گونجنے

لگا۔منیٰ کے لئے صبح ساڑھے آٹھ بجے روانگی کے سفر سے لے کر اب تک میں مسلسل چل رہا تھا۔کبھی سفر کے باعث،کبھی رستہ بھول کر،کبھی طواف اور سعی کے لئے اور اب مبارکہ کو ڈھونڈ نے کے لئے۔۔۔صبح ساڑھے آٹھ بجے سے اب رات کے دو بجے کا وقت تھا اور میرے پاؤں کا چکر ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔پاؤں میں سچ مچ چھالے سے پڑ گئے تھے۔شاعری میں چھالوں کا ذکر بڑی آسانی سے کر لیا تھا اب سچ مچ واسطہ پڑا تو پتہ چلا کہ پاؤں کے چھالے کیا ہوتے ہیں۔زخمی پیر، بے پناہ تکان اور ان سب سے بڑھ کر پریشانی اور بے بسی۔اسی حالت میں خانہ کعبہ میرے سامنے تھا۔پتہ نہیں کیسے بلھے شاہ کی کافی کا بند ذہن میں گونجنے لگا اور شاید میں اسے ہلکے ہلکے اپنے ہونٹوں سے بھی ادا کرنے لگا۔

ایس عشق دی جھنگی وچ مور بولیندا

ایس عشق دی دی جھنگی وچ مور بلیندا

ساہنوں قبلہ تے کعبہ سونہنا یار ڈسیندا

سانہوں گھائل کر کے فر خبر نہ لئی آ۔سانہوں گھائل کر کے فیر خبر نہ لئی آ

تیرے عشق نچایا کر تھیا تھیا تھیا۔۔۔۔۔۔تیرے عشق نچایا کر تھیا تھیا تھیا

میں کتنی دیر تک وہاں تھیا تھیا کی کیفیت میں رہا کچھ نہیں کہہ سکتا۔بس جب اس کیفیت سے باہر آیا تو ایک بار پھر حرم شریف کی تیسری منزل پر چلا گیا۔وہاں نماز گاہ والی جگہ سے ایک سرکاری اہلکار سے’’زوجِ گم گشتہ‘‘کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ سعی کے اختتامی حصے کے قریب ایک جگہ چند گم شدہ خواتین ہاتھ بلند کر کے کھڑی ہیں ان میں دیکھ لیں۔سعی کرنے والوں کے ہجوم سے گزرتا ہوا وہاں تک گیا تو دور سے چند خواتین ایک اونچی جگہ پر اپنے دائیں ہاتھ بلند کئے کھڑی تھیں۔ایک چہرے کو دیکھ کر کبھی گمان ہوتا تھا کہ یہ مبارکہ ہے اور کبھی لگتا تھا آنسوؤں سے دھلے ہوئے چہرے والی کوئی فلسطینی عورت ہے۔یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر یہ مبارکہ نہ ہوئی اور میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو یہیں کوئی تماشہ نہ بن جائے۔بہر حال خدا خدا کر کے مبارکہ کی نظر بھی مجھ پر پڑی اور پھر دونوں کی جان میں جان آئی۔

حرم شریف سے نکلے تو بالکل نڈھال ہونے کے باوجود محض اس وجہ سے کچھ تازہ دَم ہو گئے کہ دونوں بچھڑے ہوئے مل گئے تھے۔وہاں سے نکل کر سامنے والی سڑک پر گئے تا کہ اب سیدھا منیٰ کی طرف نکل جائیں۔اڑھائی بجے سے لے کر چار بجے تک کسی بس یا ویگن کے لئے بھاگ دوڑ کرتے رہے۔اس بھاگ دوڑ کی وجہ سے کبھی سڑک پر اور کبھی سڑک کے کنارے پر رہے۔گاڑیوں کے دھوئیں نے مزید ستیاناس کر دیا۔جب رات کے (بلکہ صبح کے) چار بج گئے اور کوئی گاڑی نہیں ملی تو مجبوراً ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔گیارہ فروری سے **بارہ فروری** ہو چکی تھی اور میں مسلسل چل رہا تھا۔وہاں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد مبارکہ کی حالت مزید خراب ہونے لگی۔پہلے ہوٹل کے ڈاکٹر کو بلایا۔اس نے حالت دیکھتے ہوئے ایمبولینس منگا لی۔اب ہم لوگ ایمبولینس میں بیٹھ کر عبدالعزیز ہسپتال جا رہے تھے۔وہاں ضروری دیکھ بھال کے بعد دوائیں وغیرہ دے کر ہمیں چھٹی دے دی گئی۔وہاں سے نکل کر حرم شریف چلے گئے۔ظہر کی نماز ادا کی۔پھر ہوٹل واپس آئے۔یہاں مبارکہ کو چھوڑا۔کیونکہ اب اس کا منیٰ جانا زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔دوا کھا کر اس پر غشی سی طاری ہو رہی تھی۔میں نے اسے بتا دیا کہ آج تینوں شیطانوں کو کنکریاں مارنی ہیں۔آپ کے حصے کی کنکریاں آج بھی میں خود ہی مار کر آؤں گا۔ویسے سچی بات ہے کل کے تجربے کے باعث مجھ پر خوف سا طاری تھا کہ کل صرف ایک شیطان کو مارنے میں کتنا حشر ہو گیا تھا،آج تینوں شیطانوں کو پتھر مارنے ہیں۔پتہ نہیں وہاں سے زندہ واپسی ہوتی ہے یا نہیں۔

جمرات پہنچ کر شیطان کو کنکر مارنے کا سلسلہ شروع ہوا تو بے شک رش کافی تھا لیکن روانگی کے وقت مجھ پر جتنا خوف طاری تھا وہ سارا دور ہو گیا۔میں نے تھوڑی محنت اور ہمت سے کام لے کر نہ صرف تینوں مقامات پر اپنے حصے کی کنکریاں ماریں بلکہ مبارکہ کے حصے کی کنکریاں بھی مار لیں۔اس بار یہ بھی اندازہ ہوا کہ ہجوم کے باعث جو ہلاکتیں ہوتی ہیں اس میں ہجوم کی زیادتی سے زیادہ بد انتظامی کا دخل ہے۔جہاں سے لوگ پتھر مارنے کے لئے جا رہے ہیں وہیں سے واپس آ رہے ہیں۔کوئی لائن یا ترتیب نہیں ہے۔بس جب ایک طرف کا چھوٹا سا ہجوم اور

مخالف سمت کا چھوٹا سا ہجوم برابر کی زور آزمائی شروع کر دیتا ہے تو پھر کچلے جانے سے یا دَم گھٹنے سے اموات ہو جاتی ہیں۔ میں انتہائی معذرت کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ اگر جرمنی کی کسی کمپنی کو اس کا انتظام سونپ دیا جائے تو یہ لوگ ایسی سیٹنگ کر دیں گے کہ لاکھوں کی تعداد کے باوجود حجاج کرام اطمینان سے اس مرحلہ سے گزر سکتے ہیں۔ جتنی اموات بھی ہوتی ہیں محض بد انتظامی کی وجہ سے۔ وہ بد انتظامی جو سارے اسلامی ملکوں کی شناخت بن چکی ہے۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تین شیطانوں سے اتنی آسانی سے گلو خلاصی ہو جائے گی۔ وہاں سے نکلا تو اطمینان سے سڑک کے کنارے لگی ہوئی عارضی دکانوں کو دیکھتا چلا۔ اپنی پسند کی چند چیزیں بھی خرید لیں۔ واپسی کے لئے ایک ویگن میں جگہ مل گئی اور میں شیطانوں کو کنکر مار کر منیٰ کی بجائے اطمینان سے واپس مکہ پہنچ گیا۔ اصولاً ہمیں یہ دن منیٰ کے خیموں میں گزارنے چاہئیں تھے۔ لیکن مبارکہ کی حالت کے پیشِ نظر ہوٹل میں قیام کرنا پڑ رہا تھا۔ منیٰ میں ہم دو راتیں ہی گزار سکے تھے جبکہ ایک رات مزدلفہ میں گزری تھی۔

شیطان کو دوسرے دن پتھر مارنے کے تجربے کے بعد مجھے کافی تسلی ہو گئی تھی اور **۱۳/فروری (۱۲ ذی الحجہ)** کو میں ہوٹل سے نکلنے سے پہلے جوتوں کے تسمے باندھتے ہوئے ڈائیلاگ مارتے ہوئے کہہ رہا تھا او شیطانو! تیار ہو جاؤ میں آ رہا ہوں۔۔۔۔ لیکن جب جمرات پہنچا تو رمی جمرات (شیطانوں کو کنکریاں مارنے کا عمل) ۱۰ ذی الحجہ سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوئی۔ لگتا ہے شیطان میرے للکارنے کا برا مان گئے تھے۔ اس بار رش اتنا زیادہ تھا کہ ایک مرحلہ پر تو مجھے سچ مچ اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا اور لگا کہ میں گیا۔۔۔ اگرچہ شیطان کو مارنے میں بری طرح نڈھال ہو گیا لیکن پھر بھی جیسے تیسے یہ کام مکمل ہو گیا۔ جمرات سے واپسی میں بھی مشکل ہو گئی۔ آج شیطان کو کنکریاں مارنے کا آخری دن تھا اور روایات کے مطابق منیٰ میں مقیم حجاج کی اکثریت آج ہی غروبِ آفتاب سے پہلے حدودِ منیٰ سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اسی لئے وہاں سے واپسی کے لئے کوئی گاڑی نہیں مل رہی تھی۔ پیدل چلنے والوں کے کئی کارواں رواں دواں تھے۔ مبارکہ ساتھ نہیں تھی تو مجھے لگا کہ میں اکیلا پیدل چل کر حرم شریف تک پہنچ ہی جاؤں گا۔ سڑک

کے کنارے کنارے بہت سے لوگ پیدل جا رہے تھے۔ میں بھی اسی طرف چلنے لگا۔ آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد ایک سکوٹر والا میرے قریب آ کر رُک گیا۔ یہ کوئی بنگالی نوجوان تھا۔ اس سے ہوٹل تک پہنچانے یا حرم شریف تک پہنچانے کی بات ہوئی۔ ۳۰ ریال میں معاملہ طے پایا۔ یوں میں نسبتاً کم تکلیف کے ساتھ ہوٹل پہنچ گیا۔ مبارکہ کو تسلی دی۔ کچھ دیر آرام کیا۔

پھر ہم عشاء کی نماز کے لئے حرم شریف کی طرف روانہ ہوئے۔ مبارکہ نے ہمت کر لی تھی کہ جیسے تیسے حرم شریف چلنا ہے۔ نماز عشاء کے بعد ساڑھے نَو بجے تک ہم صحنِ کعبہ میں بیٹھے رہے۔ اتنے بے پناہ رش کے باوجود صحنِ کعبہ میں بیٹھ کر اتنی دیر تک دیدارِ کعبہ کی سعادت مل جانا بہت بڑی بات تھی۔ پھر طواف کرنے والوں کا دائرہ وسیع ہونے لگا تو ہمیں صحنِ کعبہ سے پیچھے ہٹنا پڑا کہ طواف کرنے والوں کا حق فائق تھا۔

۱۴/فروری (۱۳/ذی الحجہ) جمعتہ المبارک کا دن اور مکہ شریف میں ہمارا آخری دن کہ اگلے روز ۱۵/فروری کو ہمیں مدینہ شریف روانہ ہو جانا ہے۔ اس لحاظ سے مکہ میں یہ ہمارا آخری دن تھا۔ منیٰ سے واپس آنے والوں کے باعث کل رات سے ہی مکہ میں رش بہت بڑھ چکا تھا۔ ہمیں آج طوافِ وداع بھی کرنا ہے۔ فجر کی نماز کے بعد ہم نے حرم شریف میں ہی سورۃ یاسین اور سورۃ صافات پڑھ کر اپنی دلی مرادیں مانگیں۔ پھر وہیں بیٹھے رہے۔ دن کے دس بجنے والے تھے جب میں نے باہر آ کر ایک وہیل چیئر والے سے بات کی۔ بات طے ہو گئی تو مبارکہ کو بھی باہر لے آیا۔ اس بار ہم نے کسی گمشدگی کی صورت میں اپنا میٹنگ پوائنٹ طے کر لیا تھا۔ مبارکہ نے وہیل چیئر پر بیٹھ کر تیسری منزل سے طواف شروع کیا اور میں نے صحنِ کعبہ ہی میں طواف کی سعادت حاصل کی۔ 10.20 بجے سے لے کر 11.35 بجے تک یہ طواف مکمل ہو گیا۔ مبارکہ بھی جلد ہی میٹنگ پوائنٹ پر پہنچ گئی۔ اس کے بعد ہم نے جمعہ نماز کی تیاری شروع کی۔ جمعہ نماز کی ادائیگی کے بعد میں نے ایک قریبی ہوٹل سے کھانا پیک کرایا۔ حرم شریف کے باہر والے وسیع فرش پر بیٹھ کر ہم نے وہ کھانا کھایا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ کھانا کھانے کے بعد مبارکہ کی طبیعت خراب ہونے لگی تو اسے ہوٹل لے آیا۔ وہاں اسے دوا دینے کے ساتھ آرام کرنے کو کہا

اور پھر خود حرم شریف آ گیا۔ یہاں سے عشاء کی نماز کے بعد ہوٹل سے کھانا پیک کرایا۔ مبارکہ کو کھانا پہنچایا۔ پھر شارع خالد بن ولید کی سڑک کے کنارے لگی ہوئی فرشی مارکیٹ کو دیکھتا ہوا حرم شریف پہنچ گیا۔اس بار صحنِ کعبہ تک پہنچ کر میں نے مقامِ ابراہیم اور درِ کعبہ کے کے سامنے ایک جگہ حاصل کر لی۔طوافِ کعبہ کرنے والوں کے وسیع دائرے سے ذرا ہٹ کر مجھے ایسی جگہ مل گئی جہاں سے دیدار ممکن تھا۔ بیٹھ کر بھی کافی دیر تک دیدار کیا۔ پھر کھڑے ہو کر الوداعی نظر ڈالنا چاہی تو جیسے پاؤں فرش سے جم گئے اور آنکھیں کعبہ شریف پر ہی گڑی رہ گئیں۔ یہ الوداعی نظر خاصی طویل ہو گئی۔شاید بیٹھ کر کئے گئے دیدار سے بھی زیادہ طویل۔۔۔اس سفر کے دوران اٹھائی گئی ساری تکالیف اور پریشانیاں ایک ایک کر کے سامنے آ رہی تھیں اور اس دیدار کی لذت میں بے معنی ہوتی جا رہی تھیں جو اس الوداعی نظر سے نصیب ہو رہی تھی۔ پھر میں ویسی ہی اداسی کی کیفیت کے ساتھ باہر آیا جیسی بہت ہی پیاروں سے بچھڑتے لمحوں والی اداسی ہوتی ہے۔

۱۵؍**فروری** (۱۴؍**ذی الحجہ**) کو ہم صبح سویرے ساڑھے پانچ بجے ہوٹل کا کمرہ چھوڑ کر اپنے متعلقہ آفس میں پہنچ گئے۔ وہیں فجر کی نماز ادا کی۔ وہیں سے ہمیں بس اسٹیشن تک لے جایا گیا۔مکہ سے مدینہ تک کا یہ سفر انتہائی تکلیف دہ تھا۔ہم صبح ساڑھے پانچ بجے کے نکلے ہوئے رات ساڑھے گیارہ بجے مدینہ میں اپنے ہوٹل تک پہنچے۔ یہ بس کا ایک عام سا سفر تھا۔اس میں کہیں ٹریفک جام ہونے کا مسئلہ نہیں تھا۔اس کے باوجود پورا اہتمام کیا گیا تھا کہ حجاج کرام کو زیادہ سے زیادہ ثواب ملتا رہے(روایت ہے کہ سفرِ حج کے دوران جتنی تکالیف اور پریشانیاں ہوں اتنا ہی سارے سفر کا ثواب ملتا ہے)۔

سوئے حجاز۔سفرِ حج سے اقتباس

حج کرنے کے بعد حج اور عمرہ کے فرق کا اندازہ ہوا۔حج فرض ہے۔عمرہ کی حیثیت نوافل جیسی ہے۔ روحانی دنیا کے اہلِ نظر بخوبی جانتے ہیں کہ فرض نماز تو صرف فرض پورا کرنے والی بات ہوتی ہے،حکم بجا لانا ہوتا ہے۔محض فرض نمازیں پڑھنے سے قربِ خداوندی نہیں

ملتا۔قربِ خداوندی کے لئے فرض سے آگے بڑھ کر نوافل کی منازل طے کرنا ہوتی ہیں۔یوں بھی فرض نماز کی باجماعت ادائیگی میں وہ روحانی لطف پیدا نہیں ہو پاتا جو اکیلے میں نوافل کی ادائیگی میں ملتا ہے ۔بس جیسے نمازوں میں فرض اور نوافل کا فرق ہے ویسے ہی حج اور عمرہ میں فرق ہے۔حج فرض ہے اور صاحبِ توفیق پر لازم ہے۔اس میں مشقت اور ریاضت کا پہلو نمایاں ہے۔عمرہ فرض نہیں ہے لیکن نوافل کی طرح اس کی لذت الگ ہے۔ابھی تک کے تجربوں سے تو یہی کچھ سمجھ میں آیا ہے۔زندگی رہی،مزید توفیق ملی
اور اگلے تجربوں میں اس تاثر سے ہٹ کر کوئی نیا تاثر بنا تو ''سوئے حجاز'' کے کسی اگلے ایڈیشن میں اسے بیان کر دوں گا۔ ورنہ ابھی تک کا جو بھی تاثر بنا ہے وہ بیان کر دیا ہے۔خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھ گنہگار کو (میری اہلیہ سمیت) نہ صرف عمرہ کی لذت عطا کی بلکہ حج کا فریضہ ادا کرنے کی توفیق بھی بخش دی۔اسے قبول کرے نہ کرے اس کی مرضی ہے۔ہمیں توفیق ملی تو ہم نے گرتے پڑتے جیسے تیسے ممکن ہوا فرض کو ادا کر لیا۔

سوئے حجاز۔سفرِ حج سے اقتباس

انٹرویوز میں ذکر

مبارکہ کی ایک سہیلی یہیں جرمنی میں مقیم ہے۔ایک بار مبارکہ سے کہنے لگی یہاں اتنے اچھے اور سستے ریڈیو ملتے ہیں میرا جی کرتا تھا ایک دوسیٹ لے کر پاکستان بھجوا دوں لیکن پھر یہ سوچ کر رُک گئی کہ یہاں کے ریڈیو سیٹ پر جرمن زبان کے پروگرام آتے ہیں۔ پاکستان والے تو انہیں سمجھ ہی نہیں سکیں گے۔ بظاہر یہ لطیفہ سا لگتا ہے لیکن میں اسے انسانی معصومیت اور بھولپن سمجھتا ہوں۔

''سلطانہ مہر کے دس سوالوں کے جواب''۔کتاب انٹرویوز، سے اقتباس

نذر خلیق: ''میری محبتیں'' آپ کے خاکوں کا مجموعہ ہے اس کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے افسانہ نگار حیدر قریشی کوئی اور ہے اور خاکہ نگار حیدر قریشی کوئی اور ہے یہاں آپ کا اسلوب افسانوی اسلوب سے بالکل مختلف ہے ایسا کیوں ہے؟

حیدر قریشی: اس سوال کا جواب دو جمع دو چار کی طرح تو نہیں دے سکتا۔اس کے جواب کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں ایسے پہلو بھی جو ایک دوسرے سے متصادم ہوں۔آپ کے سوال کے بعد غور کرتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ میری بالکل ابتدائی کہانی **مامتا** اور اب تک کی آخری کہانی **مسکراہٹ کا عکس**، یہ دونوں کہانیاں براہِ راست ہمارے گھر کی کہانیاں ہیں۔ **مامتا** میں، میں نے اپنی بیوی کے دکھ کو محسوس کیا تھا اور اس کی کہانی کو خود میں محسوس کر کے لکھا تھا۔ادبی زندگی میں یہ پہلی کہانی تھی جسے لکھنے کے بعد میں سچ مچ رویا تھا۔دوسری کہانی خود میرا اپنا نفسی تجربہ تھا جو یہاں جرمنی میں مجھے پیش آیا۔اسے آپ سوتی جاگتی حالت کا تجربہ کہہ سکتے ہیں۔اس تجربہ کے دوران مجھے جو کچھ پیش آیا وہی کچھ مجھے اس کہانی کو لکھنے کے بعد پیش آیا۔یعنی میں جی بھر کر رویا۔تو میرے بھائی میری کہانیوں میں تو میری زندگی کے کئی کردار آئے ہیں۔خاکہ نگاری اور افسانے کی اپنی اپنی حدود ہیں۔لیکن **مسکراہٹ کا عکس** میں تو جیسے یہ حدود ایک دوسرے سے مل گئی ہیں۔

''انٹرنیٹ کے ذریعے مکالمہ''۔کتاب انٹرویوز، سے اقتباس

سوال: پہلا افسانہ کونسا تھا؟

جواب: اوراق لاہور کے خاص نمبر (اوراق کے پینتیس سال)،شمارہ جنوری،فروری ۲۰۰۰ء کے صفحہ نمبر ۲۷۲ پر میرے پہلے افسانے کی اشاعت کا تذکرہ موجود ہے۔یہ شمارہ وہاں سے کسی طرح حاصل کریں۔مزے کی کہانی درج ہے۔اوراق کا مذکورہ اقتباس یہاں درج کر رہا ہوں:

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۱۹۷۹ء کے آخری شمارہ کے ذریعے میری ''اوراق'' میں انٹری ہوئی تھی۔میری غزل اوراق میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔غزل کا مطلع تھا:

اک یاد کا منظر سا خلاؤں پہ لکھا تھا جب ٹوٹتے تاروں سے کوئی جھانک رہا تھا

پھر میرے نام سے میرا پہلا افسانہ ''مامتا'' اوراق کے ۱۹۸۰ء کے پہلے شمارہ میں شائع ہوا۔یوں یہ میرا پہلا افسانہ ہوا،لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے میں افسانہ ''اندھی روشنی'' لکھ چکا تھا اور یہ افسانہ ''جدید ادب'' خانپور کے ۱۹۷۸ء کے کسی شمارہ میں اپنی بیوی (مبارکہ شوکت) کے نام سے چھاپ چکا تھا۔تب رشید امجد اور بعض دیگر جدید افسانہ نگاروں نے چونکتے ہوئے استفسار کیا کہ یہ مبارکہ شوکت کون ہیں؟،تو مجھے اپنے افسانہ لکھنے پر اعتماد سا ہونے لگا۔چنانچہ میں نے افسانہ ''مامتا'' تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ ڈاکٹر انور سدید کو بھیجا۔ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ وہ افسانہ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی دیکھ لیا اور وہ افسانہ میرے نام سے چھپنے والا میرا پہلا افسانہ ''اوراق'' کے ۱۹۸۰ء کے پہلے شمارہ میں شائع ہو گیا'' (تاثرات بعنوان ''اوراق اور میں'' مطبوعہ اوراق لاہور،پینتیس سالہ نمبر شمارہ جنوری،فروری ۲۰۰۰ء)

اس میں اتنا اضافہ کروں گا کہ میرے سب سے پہلے لکھے گئے افسانہ ''اندھی روشنی'' کو معیار دہلی کے پاکستانی افسانہ نگار نمبر (نیا پاکستانی افسانہ، نئے دستخط مطبوعہ ۱۹۸۲) میں میرے نام کے ساتھ شائع کیا گیا تھا جو اپنی ابتدائی عمر میں میرے لئے بڑی کامیابی تھی۔

''عبدالرب استاد کے سوال اور حیدر قریشی کے جواب''۔انٹرویوز،انٹرنیٹ ایڈیشن سے اقتباس

سوال :افسانے میں دو عورتیں موجود ہیں۔ایک تو وہ جو گھوڑی بنی ہوئی ہے،دوسری وہ جو خاندانی منصوبہ بندی میں برابر کی شریک ہے۔سوال یہ ہے کہ آپ نے عورت کا کوئی خاص نظریہ پیش کرنا چاہا ہے یا یہ افسانے کی ضرورت تھی؟

جواب: عورت کا کوئی خاص نظریہ پیش کرنا کبھی بھی میرے پیش نظر نہیں رہا۔ پہلے والے سوال کے جواب کو دہرانا پڑ رہا ہے۔ گھروں کے مسائل موجود تھے۔۔۔ کچھ میرے ارد گرد تھا، جس میں گھوڑی کی طرح جتی ہوئی عورت بھی تھی، اورخاندانی منصوبہ بندی میں شریک عورت بھی تھی۔ ویسے آپ کو سچی بات بتاؤں، یہ منصوبہ بندی والا حصہ میری اور میری اہلیہ کی داستان ہے۔ تب سات سال کے وقفہ کے بعد چوتھی اولاد اور میرا تیسرا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ البتہ کھنڈر سے کھوپڑی ملنے والی بات کا میری ذاتی جاب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کہانی کا اپنا کیا دھرا ہے۔

سوال: آپ نے اپنے افسانوں میں خوبصورت عورت کو استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔ کوئی خاص وجہ؟

جواب: عورت کے کئی روپ ہیں جو میرے افسانوں میں آئے ہیں۔ ان میں ماں، بہن، بیوی، بیٹی تک کے رشتے موجود ہیں۔ انتہائی مظلوم عورت (شناخت) کا کردار بھی موجود ہے۔ گویا دیگر کئی روپ میں عورت موجود ہے۔ مقدس رشتوں میں بھی یہ روپ خوبصورت ہی ہیں۔ بلکہ یاد آیا مجھے کتابی چہرے اس لیے اچھے لگتے ہیں کہ میری والدہ کا چہرہ کتابی تھا اور میری اہلیہ بھی ان کی بھتیجی ہونے کی وجہ سے ان سے مشابہت رکھتی ہیں۔ سو میرے لیے عورت کی خوبصورتی کا محور میری ماں اور انہیں کے حوالے سے میری بیوی ہیں۔ اب اس بات کو دوسری سطح پر بھی دیکھ لیتے ہیں۔ خوبصورت عورت کا ذکر خوبصورت ہی لگتا ہے۔ تاہم میرے ایک افسانے (آپ بیتی) میں میری ''ایک بہت اچھی دوست'' کا ذکر ہے۔ دراصل اسے کچھ تنگ کرنے کے لیے بھی میں نے ایک بار دانستہ ایک بہت خوبصورت لڑکی کا ذکر کیا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اُس اچھی دوست نے جب بھی اس لڑکی کا ذکر کیا ہمیشہ کچھ یوں کہا ''آپ کے افسانے کی ہیروئن کا کیا حال ہے؟''۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ''اچھی دوست'' اُس ہیروئن سے زیادہ خوبصورت تھی (ہے)۔ اور دونوں ہی کتابی چہرے والیاں تھیں۔

''رضینہ خان کے سوال۔ حیدر قریشی کے جواب''۔ انٹرویوز، انٹرنیٹ ایڈیشن سے اقتباس

منزہ یاسمین کے سوالوں کے جواب کے ساتھ

حیدر قریشی کی شریک حیات مبارکہ حیدر

سوال: حیدر قریشی کے موجود حلیے کے بارے میں رائے؟

جواب: ہاہاہا۔۔۔۔ہاہاہا۔۔۔۔

ویسے ان کی سنجیدہ تصویر ہمیشہ اچھی آتی ہے۔ آپ کے سوال سے تھوڑی غیر متعلق ایک بات بتاؤں۔۔ جوانی میں ان کے داڑھی تھی۔ مجھے وہ داڑھی واقعی اچھی لگتی تھی۔ جرمنی میں آ کر انہوں نے داڑھی صاف کر دی اور کہا کہ تم نے میری داڑھی کی تعریف کر کر کے مجھے داڑھی والا بنا دیا، اور میری ساری جوانی خراب کر دی۔ اب میں ان سے کہتی ہوں کہ آپ بغیر ٹوپی کے دانشور لگتے ہیں تو کہتے ہیں جوانی خراب کرنے کے بعد اب میرا بڑھاپا بھی خراب کرنا چاہتی ہو۔

سوال: لباس کیا پہنتے ہیں؟

جواب: گھر پر عموماً سلوار قمیص اور گھر سے باہر پتلون شرٹ۔ ویسے ابھی حال ہی میں ایک شیروانی تیار کرائی ہے اور ایک پگڑی بھی منگا رکھی ہے۔ لیکن ابھی پہنی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے اب یہ اپنے والد صاحب کے مقام پر فائز ہونے والے ہیں۔ پھوپھا جان نے بھی ایک عرصہ تک ٹوپی کے استعمال کے بعد پگڑی پہننا شروع کر دی تھی۔

سوال: خوراک کے معاملے میں کیسے ہیں؟

جواب: صابر شاکر ہیں۔ جیسا بھی مل جائے، کھا پی لیتے ہیں۔ کبھی کبھار ٹی وی دیکھتے ہوئے ڈرائی فروٹ کھانے میں بد پرہیزی کر جاتے ہیں۔ نہاری اور پائے شوق سے کھاتے ہیں۔

سوال: حیدر قریشی کا آپ سے تعلق کیا ہے اور کیا آپ دونوں میں مکمل ہم آہنگی ہے؟

جواب: بڑا ہی جائز قسم کا تعلق ہے۔ جائز تعلق میں جتنی ہم آہنگی ہوسکتی ہے وہ ہم دونوں میں

ہے۔ویسے ہمارے Taste ایک دوسرے سے بالکل متصادم ہیں مگر رشتہ بہت ہی پکا ہے۔مرنے کے بعد بھی نہ ٹوٹنے والا۔

سوال: حیدرقریشی مزاجاً کیسی طبعیت کے مالک ہیں؟

جواب: بہت میٹھے اور بہت کڑوے۔اپنے ہر روپے میں انتہا پسند۔انسان کو تھوڑا بہت مصلحت پسند ہونا چاہئے۔

سوال: حیدرقریشی کا حلقہ احباب کتنا اور کیسا ہے؟

جواب: پرانا حلقہ احباب تو وہی ہے جو ابتدا میں تھا۔سعید شباب،نذر خلیق،فرحت نواز (فرحت کے ساتھ میری دوستی ان سے زیادہ ہے)۔۔۔،ادبی احباب میں ڈاکٹر وزیر آغا سے لے کر اکبر حمیدی تک ایک لمبی فہرست ہے۔اب انٹرنیٹ پر ان کے دوستوں کا ایک اور بڑا حلقہ سامنے آیا ہے۔جن میں سب سے اہم خورشید اقبال صاحب ہیں جو اردو دوست ڈاٹ کام کے مالک ہیں۔پھر امریکہ کے اردوستان والے کاشف الہدیٰ صاحب ہیں۔اور بھی بہت سے ہیں القمر والے بھی ہیں۔۔۔مگر مجھے ان ناموں کا زیادہ علم نہیں ہے۔اس کے باوجود ان کا مزاج غیر مجلسی اور تنہائی پسندی کا ہے۔

سوال: کیا آپ حیدرقریشی کی ادبی زندگی کو پسند کرتی ہیں؟

جواب: ادبی زندگی تو خیر ٹھیک ہے لیکن اب جو انہوں نے انٹرنیٹ پر ادبی کام شروع کئے ہیں۔ان سے میں بہت تنگ ہوں۔ہر وقت کمپیوٹر میں گھسے بیٹھے ہیں۔جاب پر جانے سے پہلے انٹرنیٹ پر ہوتے ہیں۔جاب سے آتے ہی انٹرنیٹ پر بیٹھیں گے۔ڈاک دیکھیں گے،جواب لکھیں گے۔پھر کھانا کھائیں گے۔کھانے کے بعد ٹی وی پر خبریں دیکھتے ہی پھر انٹرنیٹ میں چلے جائیں گے۔۔۔۔میں کمپیوٹر والے کمرے کو اپنی سوتن کا کمرہ کہتی ہوں۔

سوال: آپ کو حیدرقریشی کس حیثیت میں زیادہ پسند ہیں؟

جواب: یہ تو آج تک کبھی سوچا ہی نہیں۔دراصل میں نے انہیں خانوں میں تقسیم کر کے دیکھا ہی نہیں۔

سوال: حیدرقریشی کی ادبی زندگی کے بارے میں آپ کے تاثرات؟

جواب: میں عموماً ان کی ادبی زندگی کی مصروفیت کی وجہ سے نالاں رہتی ہوں۔میں گھر پر ہوتی ہوں تو ان کو اپنے ادبی کاموں سے فرصت نہیں ہوتی۔ایک بار میں دو دن کے لئے اپنی بیٹی کے ہاں گئی۔واپس آئی تو کہنے لگے کہ آپ گھر پر موجود ہوں تو آپ کی موجودگی کے احساس کے باعث خود بخود ادبی کام ہوتا رہتا ہے لیکن آپ گھر پر نہیں تھیں تو کسی قسم کا کام کرنے کو جی نہیں چاہا۔یہ ان کے لئے بھی انکشاف تھا اور میرے لئے بھی۔۔لیکن یہ واقعی ایک خوشگوار حقیقت ہے۔

سوال: حیدرقریشی کو بحیثیت شوہر کیسا پایا؟

جواب: بس ٹھیک ہی ہیں۔۔۔آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے ان سوالات کے ذریعے مجھے ایک موقعہ دیا۔ (۲۴/اکتوبر۲۰۰۲ء)

منزہ یاسمین کے سوال اور مبارکہ حیدر کے جواب۔انٹرویوز سے

منزہ یاسمین کا سوال،فرحت نواز کا جواب

سوال: پہلی ملاقات کا تاثر؟

جواب: پہلی ملاقات کا تو تعین ہی نہیں ہوا،تاثر کیا بتاؤں؟۔۔ہاں اس تعلق کے بارے میں ایک بات بتادوں کہ ہم سال کے گیارہ مہینے لڑتے رہتے تھے اور ایک مہینہ ہمارا صلح صفائی میں گزرتا تھا۔اگر کبھی سچ مچ جھگڑا زیادہ ہو گیا تو ہماری صلح کے لئے مبارکہ بیچ میں آجاتی تھیں۔اگر میں یہ کہوں کہ مبارکہ،حیدرقریشی کی بیوی سے زیادہ ان کی اچھی دوست ہیں تو غلط نہ ہوگا۔اور جتنی اُن کی دوست ہیں اتنی ہی میری دوست ہیں۔

منزہ یاسمین کے سوال اور فرحت نواز کے جواب۔انٹرویوز سے اقتباس

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

سوالنامہ از شائستہ زرّیں (کراچی)

جواب از: مبارکہ حیدر (جرمنی)

۱:: خریداری ہُنر ہے یا جھنجٹ؟

جواب: خریداری کرنا ویسے تو ہنر ہے، لیکن کبھی کبھار جھنجھٹ بھی ہو جاتا ہے۔

۲:: آپ کی نظر میں خریداری کا بنیادی اصول کیا ہے؟

جواب: ضرورت کے مطابق چیز مناسب ہو اور قیمت بھی مناسب ہو۔

۳:: خریداری کے لیے آپ ایک ہی مارکیٹ کا انتخاب کرتی ہیں یا ایک سے زائد میں جا کر فیصلہ کرتی ہیں؟

جواب: یہاں جرمنی میں مارکیٹوں کا سسٹم پاکستان سے کافی مختلف ہے۔کسی ایک مارکیٹ میں چلے جائیں تو عام طور پر ضرورت کا سارا سامان وہیں سے ہی مل جاتا ہے۔اس لئے ایک بار کی شاپنگ تو ایک ہی مارکیٹ میں کر لیتی ہوں۔لیکن اگلی شاپنگ کے لئے دوسری مارکیٹیں بھی دیکھ لیتی ہوں۔اس طرح مختلف مارکیٹوں میں نرخوں کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ویسے فرق بہت معمولی سا ہی ہوتا ہے۔

۴:: جیولری، ملبوسات، کاسمیٹکس، آرائشی اشیاء، گھریلو استعمال کی اشیاء، ادویات، بچوں کی خریداری۔خریداری کے وقت ترجیحات کے لحاظ سے کیسے نمبر ترتیب دیں گی؟

جواب: گھریلو استعمال کی اشیاء، بچوں کی خریداری، ملبوسات، کاسمیٹکس، آرائشی اشیاء اور جیولری۔۔۔۔ادویات کا واضح کر دوں کہ ہمیں یہاں میڈیکل چیک اپ سے لے کر ادویات تک سب

سہولیات فری میسر ہیں۔

۵:: دکاندار کی بتائی ہوئی قیمت پر خرید لیتی ہیں یا دام کم کرواتی ہیں؟ اندازاً کتنے فیصد کم کرواتی ہیں؟

جواب: یہاں قیمتیں فکس ہوتی ہیں۔ان میں کمی بیشی نہیں ہوتی ہاں کبھی پاکستانی، افغانی اور ترکی دوکانداروں تک جانا پڑے تو وہاں دام کروانے کی صورت بن جاتی ہے۔یہاں کی بڑی مارکیٹیں سال میں دو بار خاص سیل لگاتی ہیں۔میں ان تاریخوں سے باخبر رہتی ہوں۔اس سیل میں ۴۰ سے ۵۰ فی صد تک قیمتیں کم ہو جاتی ہیں۔میں اس سہولت سے بروقت فائدہ اٹھا لیتی ہوں۔

مطبوعہ ماہنامہ **پاکیزہ** کراچی۔**عید نمبر**۔نومبر ۲۰۰۷ء

نظم

پھاگن کی سفّاک ہوا

ہوا سفّاک لہروں کی طرح
یخ بستہ تیروں سے مسلسل حملہ آور ہے
میں اپنے بند کمرے میں مسہری پر
رضائی لے کے بیٹھا ہوں
مِری بیوی مِرے پہلو میں بیٹھی ہے
شعیب، عثمان، ٹیپو، مانو، رضوانہؔ
ہمارے سامنے
پہلو بہ پہلو دائرے کی شکل میں بیٹھے
ہماری مُورتیں ہم کو دکھاتے ہیں
ہمارا گمشدہ بچپن ہمارے سامنے
ان پانچ رنگوں میں چہکتا ہے
ہوا سفاک لہروں کی طرح
یخ بستہ تیروں سے مسلسل حملہ آور ہے
کبھی تیروں کی اک بوچھار سی
جب بند دروازے پہ پڑتی ہے تو بچے

ایک لحظے کے لئے خوف اور حیرت سے
ہمارے منہ کو تکتے ہیں
اور اپنے آپ ہی پھر کھلکھلا کر ہنس بھی پڑتے ہیں

اگر اس وقت پھاگن کی ہوا سفّاک نہ ہوتی
تو میں اس بند کمرے میں
حَسیں بچپن کے ایسے جگمگاتے
اور سہانے دن کہاں پاتا
جہاں گردی کے چکر میں
ہمیشہ کی طرح کھویا ہوا ہوتا
یہ پھاگن کی ہوا سفاک بھی ہے مہرباں بھی ہے!

ماہیا

بیوی

اک رُوح کا قصہ ہے
میرے بدن ہی کا
جو گم شدہ حصہ ہے

نظم

نصف سلور جوبلی

شبِ اوّل کی وہ محجوب سی
اک اوّلیں ساعت
تبسّم زیرِ لب
جب گنگناتی خامشی
اک گیت بن کر جسم میں اتری!

پھر اک مدھم ہنسی، مدہوش سرگوشی
مجسم گیت بن کر وہ چہکتا
گیت گاتا اک پرندہ
پھول اور کلیاں
خزاں نا آشنا کِھلتی بہاریں، زندگی!

زندگی
پھر زندگی کی رُوح سے لبریز چہکاریں
جو گاہے کھلکھلاتیں، شور ہنگامہ بپا کرتیں
جو گاہے جھینپ بھی جاتیں
جواں، سرسبز جسموں کی مہک

شادابیاں
وہ روح کی پاتال تک سیرابیاں!

سرشاریاں
شاداب اور سیراب جسم و جان سے چھلکیں
تو آنگن میں بہاریں اور چہکاریں
دمک اٹھیں
ستارے، پھول، کلیاں
خوشبوئیں اور روشنی......روشن
شرارت، کھیل، جھگڑا اور
صلح و آشتی، پھر آشتی کے ساتھ ہی جھگڑا
کتابیں، کاپیاں، پنسل، قلم اور ہوم ورک
اتنے شرارت سے بھرے چہروں پہ ایسا نُور
یہ معصومیت، پاکیزگی
گنگناتے، کھنکھناتے، جگمگاتے قہقہے
زندگی ہی زندگی

بارہ برس اور چھ مہینے
آج پورے ہوگئے ہیں اپنی شادی کو!

ڈاکٹر انوار احمد کا کالم ''وعدہ خلافی''

اور بیویوں کے ذکر کا مسئلہ

adabi group <urdu_writers@yahoogroups.com>

Sent: Tuesday, January 29, 2013 10:52 AM

ڈاکٹر انوار احمد کے کالم ''وعدہ خلافی'' کی آج کی تحریر کا ذیلی عنوان ہے ''یہ بازی عشق کی بازی ہے''،اس کالم کا لنک یہاں پیش کر رہا ہوں۔شہرت بخاری مرحوم اوران کی اہلیہ فرخندہ بخاری کے حوالے سے یہ ایک سبق آموز کالم ہے۔اس میں ڈاکٹر انوار احمد نے ایک انتہاہی جملہ لکھا ہے:

''انسان کو آپ بیتی میں رفیقِ حیات کو خراجِ تحسین پیش کرتے وقت محتاط ہونا چاہیے۔شاید کہ پلنگ خفتہ باشد''

ہر چند دنیا کی طرح زندگی کے حالات بھی کب کیا رُخ اختیار کر لیں، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ بیوی کے بارے میں لکھتے وقت نمائشی اور جھوٹ لکھنے سے گریز کرنا چاہیے ورنہ بندے کا شہرت بخاری مرحوم جیسا حال ہو جاتا ہے۔بے شک پورا سچ نہ لکھیں لیکن جتنا بھی لکھیں سچ لکھیں۔بعد میں زندگی کے کسی موڑ پر شرمندگی نہیں ہوگی۔

میں نے اپنی اہلیہ کا خاکہ ''پسلی کی ٹیڑھ'' سال ۱۹۹۰ء کے آس پاس لکھا تھا۔تب ہی یہ خاکہ ''اوراق'' میں شائع ہو گیا تھا۔اس خاکہ کے بعد بھی میں نے اپنی یادوں کے ابواب میں اور متعدد دیگر تحریروں میں اپنی اہلیہ کا ذکرِ فراواں کیا ہے۔سوادبی زبان میں اہلیہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے کرتے رُبع صدی ہونے کو آ رہی ہے۔نہ کبھی غیر ضروری احتیاط کی ہے، نہ ہی قلم کو غیر محتاط ہونے دیا ہے۔اہلیہ کا جتنا ذکر کر چکا ہوں اس سب کے باوجود خود کو اہلیہ کی محبت کا مقروض سمجھتا ہوں۔یہ تحریر اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ دوسرے ادیب حضرات اپنی اہلیہ کے ذکر میں بخیل نہ ہو جائیں۔ **حیدر قریشی**

لنک

ڈاکٹر انوار احمد کا کالم ''وعدہ خلافی''۔۔یہ بازی عشق کی بازی ہے

h**ttp://dunya.com.pk/index.php/author/dr.-anwar-ahmad/2013-01-29/1735/34217038#.UQeWXuSHy6U**

اردو رائٹرز ایٹ یاہو گروپس ڈاٹ کام سے تحریر ریلیز کرنے کے بعد ایسے متعدد ادیبوں کو بھی بھیجی گئی جو اس گروپ کے ممبر نہیں تھے۔ڈاکٹر انوار احمد صاحب کو بھی یہ ای میل بھیجی گئی۔اُسی روزان کی طرف سے اس تحریر کی رسید کے طور پر یہ ای میل موصول ہوئی۔

ahmadanwaar49@yahoo.com

To

me

Jan 29, 2013

How lucky you are

Regards,

Anwaar

Sent: 29/01/2013, 2:55 pm

ڈاکٹر عبدالرب استاد، ہردئے بھانو پرتاپ،
رضینہ خان، منزہ یاسمین اور عامر سہیل کے

پی ایچ ڈی، ایم فل اور ایم اے کے مقالات میں ذکر

ان کے گھر جتنے بھی افراد رہتے ہیں وہ سب اردو لکھتے، پڑھتے اور بولتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔آفرین صد آفرین کہنا پڑتا ہے حیدر قریشی اور آپ کے خاندانی افراد کو۔کیونکہ انہوں نے اتنا تو کیا۔ان کے افرادِ خانہ جن میں ان کی اہلیہ مبارکہ بھی قابلِ مبارکباد ہیں کیونکہ انہوں نے ایک مشرقی عورت، مشرقی ماں، مشرقی نانی، اور مشرقی دادی ہونے کا پورا پورا حق ادا کیا اور باقاعدہ ادا کرتی جا رہی ہیں۔

عبدالرب استاد کے پی ایچ ڈی کے مقالہ ''حیدر قریشی شخصیت اور ادبی جہات'' سے اقتباس

لیکن جب Internet پر ان کے دوستوں کا حلقہ بڑھنے لگا تو ان کی بیگم مبارکہ صاحبہ کو اس سے تھوڑی بہت پریشانیاں بھی ہوئیں یہاں تک کہ مبارکہ صاحبہ نے کمپیوٹر کو اپنی سوتن تک بنا ڈالا۔لیکن انٹرنیٹ پر مصروف رہنے کے باوجود حیدر قریشی اپنی اہلیہ مبارکہ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔اس کا انکشاف اس وقت ہوا جب وہ دو روز کے لئے اپنی بیٹی کے یہاں چلی گئی تھیں اور حیدر صاحب کوئی بھی کام نہ کر سکے۔بلآخر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیدر قریشی ایک اچھے شاعر و ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شوہر اور والد بھی ہیں۔

ہردئے بھانو پرتاپ کے ایم فل کے مقالہ ''حیدر قریشی کی شاعری کا مطالعہ'' سے اقتباس

ماں کا نرم و نازک لہجہ جب بھی ان کی آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو حیدر قریشی کا شاعر دل بھر آتا ہے اور آنکھیں چھلک پڑتی ہیں اور ایسا ہونے سے ماں کی ممتا پھر سے تازی ہو جاتی ہے۔لیکن حیدر قریشی جب اپنی بیوی کا ذکر کرتے ہیں تو یہی محبت ایک نئے رخ کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔پھر ان کا تخلیقی قلم ایک نیا شعر لکھتا ہے ۔

(بیوی)

اک روح کا قصہ ہے
میرے بدن ہی کا
جو گم شدہ حصہ ہے

حیدر قریشی نے اس شعر میں بیوی کو اپنے جسم کا گم شدہ حصہ قرار دیا ہے۔یہ بات فلمی نغموں سے لے کر ادبی تصنیفات اور مذہبی کتابوں میں بھی بڑے وثوق کے ساتھ کہی جاتی ہے۔اس کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ہر مذہبی کتاب اس بات کو اپنے اپنے طریقے سے بیان کرتی ہے۔شاعر نے یہاں پر اس دنیا کی ایک ایسی سچائی کا بیان کیا ہے جس کی بنیاد اس دنیا کے وجود میں آنے سے جا کر ملتی ہے۔یہاں پر حیدر قریشی کا نظریہ بالکل واضح ہو جاتا ہے اور ماں اور بیوی دونوں کی کیا اہمیت ہے یہ بھی صاف صاف سمجھ میں آ جاتا ہے۔ویسے تو بچہ جس ماں کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اس سے اس کا اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے۔یہاں تک کہ بعض دفعہ ماں کی بہت سی خصوصیات بھی بچوں میں چلی آتی ہیں۔لیکن حیدر قریشی اس بچے کو ماں کے جسم کا حصہ قرار نہیں دیتے ہیں اور یہی اصل سچائی بھی ہے۔مرد کی دنیا ایک عورت (بیوی) کے ملنے کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے اور عورت کی دنیا ایک مرد (شوہر) کے ملنے کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے۔اس فلسفے کو حیدر قریشی بہت ہی آسان الفاظ میں ماہیے کے محض تین مصرعے میں بہت ہی کامیابی سے پیش کرتے ہیں۔ان دونوں ماہیوں کو پڑھنے سے ماں اور بیوی دونوں کا بنیادی فرق واضح ہو جاتا ہے۔

ہردئے بھانو پرتاپ کے ایم فل کے مقالہ ''حیدر قریشی کی شاعری کا مطالعہ'' سے اقتباس

''پسلی کی ٹیڑھ'' کتاب میں شامل آٹھواں خاکہ ہے جو حیدر قریشی نے اپنی بیوی کا لکھا ہے۔ خاکے کی ابتدا نہایت ہی خوبصورت شعر سے کی گئی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

پھول تھا وہ تو میں خوشبو بن کے اس میں جذب تھا
وہ بنا خوشبو تو میں بادِ صبا ہوتا گیا

اس خاکہ کو لکھنے سے پہلے حیدر قریشی اس کشمکش میں مبتلا تھے کہ کہیں ان سے کوئی زیادتی نہ ہو جائے۔ شاید اسی وجہ سے انہوں خاکے کی ابتدا سے پہلے ہی سچ لکھنے کا اقرار کر لینا مناسب سمجھا۔ لکھتے ہیں۔

''بیوی۔۔۔۔بالخصوص زندہ بیوی کا خاکہ لکھنا اپنی خیریت کو داؤ پر لگانے اور شیر بلکہ شیرنی کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ بہر حال میں اقرار کرتا ہوں کہ جو کچھ لکھوں گا سچ لکھوں گا۔ سچ کے سوا کچھ نہ لکھوں گا۔ اللہ میری حفاظت فرمائے۔ (آمین)'' (۲۹)

زیرِ نظر خاکے میں حیدر قریشی نے اپنی اہلیہ (مبارکہ) کی شخصیت سے قاری کو بخوبی متعاف کرایا ہے۔ لکھتے ہیں'' مبارکہ صاف دل اور صاف گو عورت ہے۔ محبتی بیوی اور بے تکلف ماں ہے۔'' (۳۰)

یہ خاکہ حیدر قریشی اور ان کی بیوی کے درمیان محبت، سمجھ ،اور رشتہ پہ اعتماد کی کھلی وضاحت کرتا ہے۔ حیدر قریشی کا یہ خاکہ میاں بیوی کے درمیان ایک صحت مند رشتہ کی تصویر پیش کرتا ہے۔۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ میاں بیوی میں محبت بہت زیادہ ہو تو دونوں میں شباہت یکساں ہو جاتی ہے۔ فیض اور ایلس کی تصویریں دیکھ کر یہ بات سچ معلوم ہونے لگتی ہے۔ میری اور مبارکہ کی شکلوں میں بھی کچھ ایسا تغیر رونما ہو رہا ہے۔ ''من تو شدم تو من شدی'' کی حد تک تو محبت ٹھیک تھی لیکن جب اس مقام سے آگے بڑھی تو پھر دونوں کی شکلیں بگڑنے لگیں اور بگڑتے بگڑتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ'' تم رہے نہ تم ہم رہے نہ ہم''۔۔۔اچھی بھلی شکلیں بگڑ گئیں مگر ہماری محبت کی شدت تو ثابت ہوگئی۔ (۳۱)

حیدر قریشی اور ان کی بیوی مبارکہ کے درمیان کس حد بے تکلفی اور اعتماد کا رشتہ قائم ہے یہ بات اس خاکہ میں مکمل طور پر نظر آتی ہے۔ بالآخر حیدر قریشی لکھتے ہیں'' اس سے زیادہ مبارکہ کے بارے میں لکھنے کی جرات نہیں۔ اس خاکے کا دوسرا حصہ مبارکہ کی وفات کے بعد لکھوں یا میری وفات کے بعد وہ لکھے گی۔

رضینہ خان کے ایم فل کے مقالہ'' حیدر قریشی کی افسانہ نگاری کا مطالعہ'' سے اقتباس

حیدر قریشی نے اپنی پڑھائی کے سلسلے کو جاری رکھا۔ انہوں نے ۱۹۷۰ء میں پرائیویٹ امیدوار کے طور پر ایف۔اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۷۱ء میں اٹھارہ سال کی عمر میں ان کی شادی ان کے ماموں کی بیٹی'' مبارکہ'' سے ہوگئی۔ حیدر قریشی نے نوکری اور شادی شدہ زندگی کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ طور پر اپنا سلسلہ تعلیم بھی جاری رکھا۔

منزہ یاسمین کے ایم اے کے مقالہ'' حیدر قریشی شخصیت اور فن'' سے اقتباس

'سلگتے خواب' کا انتساب حیدر قریشی نے اپنی شریک حیات'' مبارکہ'' کے نام کیا ہے۔ انتساب یوں ہے۔

مبارکہ کے نام

استعارے سے تو کچا سامنے اس کے حیدرؔ
شاعری ایک طرف اپنی دھری رہتی ہے

منزہ یاسمین کے ایم اے کے مقالہ'' حیدر قریشی شخصیت اور فن'' سے اقتباس

نظم'' پھاگن کی سفاک ہوا'' میں حیدر قریشی کے شائستہ اور مہذب لب ولہجہ میں ایک نرم ولطیف محبت کا احساس ملتا ہے۔ اس نظم میں شاعر کی شریک حیات بھی متحرک نظر آتی ہے اور اس کے بچے بھی۔ اس کی امیدیں بھی ہیں اور آنے والے سہانے دنوں کا تصور بھی۔ اس کی نظم

میں ماضی بھی ہے، حال بھی اور مستقبل بھی۔

منزہ یاسمین کے ایم اے کے مقالہ ''حیدر قریشی شخصیت اور فن'' سے اقتباس

ہماری شاعری میں عموماً بیوی کا ذکر کم ملتا ہے لیکن حیدر قریشی نے اپنی ازدواجی زندگی کے ساڑھے بارہ سال مکمل ہونے پر ''نصف سلور جوبلی'' کے نام سے جو نظم کہی ہے وہ اُن کے جذبات کی شگفتگی اور محبت کی انتہا کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے اپنی اس نظم میں اپنے بچوں کو بھی جزوِ حیات بنالیا ہے۔۔۔۔۔اس نظم کی مسرتوں اور اطمینان سے بھرپور سطریں دل میں ایک عجیب خوش گوار احساس پیدا کرتی ہیں۔ ان نظموں میں حیدر قریشی محبت کے رشتوں کو حقیقت کی آنکھ سے دیکھتا نظر آتا ہے۔

منزہ یاسمین کے ایم اے کے مقالہ ''حیدر قریشی شخصیت اور فن'' سے اقتباس

زوجہ مبارکہ کا خاکہ

اُردو ادب میں خاکہ نگاری کی روایت اور ذخیرے پر نظر کی جائے تو علم ہوتا ہے کہ لکھنے والوں نے تقریباً ہر قسم کی شخصیت پر دل کھول کر لکھا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی ادیب نے اپنی بیوی پر خاکہ لکھ کر محبت کا ثبوت فراہم کیا ہو۔ حیدر قریشی کا تخلیقی قلم جہاں تمام اہلِ خانہ کے ذکر پر روانی اور جولانی کا مظاہرہ کرتا ہے وہاں اہلیہ کا ذکرِ خیر بھی فراخ دلی سے صفحہء قرطاس کی زینت بنتا ہے۔ اس موضوع میں اُن کی خاص دل چسپی نظر آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ نظم ونثر کی اہم اصناف میں وہ اپنے دل پسند موضوع کو حد درجہ سلیقے اور قرینے سے نبھاتے ہیں۔ اس دل چسپ اور شگفتہ خاکے کا آغاز ایک حسبِ روایت طبع زاد شعر سے ہوتا ہے:

ے پھول تھا وہ تو میں خوشبو بن کے اس میں جذب تھا
وہ بنا خوشبو تو میں بادِ صبا ہوتا گیا

حیدر قریشی نے خاکے کا عنوان بھی بہت منفرد رکھا ہے۔۔۔۔''پسلی کی ٹیڑھ'' (مبارکہ)۔ خاکے

کی ابتدائی سطور قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ انداز ملاحظہ ہو:

'' بیوی۔۔بالخصوص زندہ بیوی کا خاکہ لکھنا اپنی خیریت کو داؤ پر لگانے اور شیر بلکہ شیرنی کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ بہر حال میں اقرار کرتا ہوں کہ جو کچھ لکھوں گا سچ سچ لکھوں گا۔۔سچ کے سوا کچھ نہ لکھوں گا۔ (کلیات: ص۳۱۱)

''پسلی کی ٹیڑھ'' میں خاکہ نگاری کے ممکنہ اہم نکات اور وسائل یکجا صورت میں ملتے ہیں۔ بچپن کا تذکرہ نہایت میٹھے انداز میں سامنے آتا ہے اور قاری کو پتا چلتا ہے کہ حیدر قریشی نے بچپن کی معصومیت میں ماموں کی بیٹی سے شادی کرنے کی جس خواہش کا اظہار کیا تھا وہ بالآخر پوری ہو گئی تھی۔ وہ خود بھی کہتے ہیں:

'' بچپن میں غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر کہی ہوئی مذاق کی ایک بات اتنی سنجیدگی اختیار کرگئی کہ اب وہ سارا مذاق وجدانی معلوم ہوتا ہے۔'' (کلیات: ص۳۱۱)

یہ خاکہ اپنائیت اور محبت کی ملی جلی کیفیات کا عکاس ہے، اور اگر اسے ''میری محبتیں'' کا کلیدی اور نمائندہ خاکہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اُردو ادب میں ایسے خاکے کم ملتے ہیں جس میں اپنی اہلیہ کو اتنے ادبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔ ہمارے ہاں بیویوں کا تمسخر اُڑانا عام سی بات اور اگر کبھی تعریف بھی کرنا پڑ جائے تو اُس میں سے بھی ایسے پہلو لازماً تلاش کر لیتے ہیں ہیں جس میں طنز پوشیدہ ہوتا ہے۔ حیدر قریشی کے ہاں یہ رویہ کسی سطح پر نہیں پایا جاتا۔ اس کے برعکس توازن اور شائستگی نظر آتی ہے۔ یہ توازن اوصاف نگاری کے دوران بھی برقرار رہتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے:

'' مبارکہ صاف دل اور صاف گو عورت ہے۔ محبتی بیوی اور بے تکلف ماں ہے۔
ماں والی دھونس نہیں جماتی البتہ دوستانہ دھونس ضرور جماتی ہے۔'' (کلیات: ص۳۱۳)

حیدر قریشی کو جہاں اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنا ہوتا ہے وہ بھی برملا کر دیتے ہیں۔

''میں اپنی فکری آزادہ روی کے باعث مبارکہ کے لیے بہت تکلیف کا سامان کر بیٹھا۔'' (کلیات: ص۳۱۳)

اس ادبی خاکے میں ہر طرح کے رنگ موجود ہیں۔کہیں ممدوح کی شخصیت نمایاں کرنے کی خاطر گہرے شوخ رنگ برتے گئے ہیں اور کہیں کہیں ہلکے رنگ شخصیت کی پرتیں کھولتے چلے جاتے ہیں۔خاکہ نگار نے جالفاظی اور طوالت سے اپنا دامن بچایا ہے۔مختصر اشارے کنائے اس تحریر کا خاص حسن ہے جس کی وجہ سے شخصیت کا ناک نقشہ اور عادات واطوار کا بیانیہ فطری اُسلوب متاثر کرتا ہے۔حیدر قریشی جانتے ہیں کہ خاکہ نگاری ایک ایسی ظالم صنف ہے جس میں ایجاز واختصار کا جادو اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔

عامر سہیل کے ایم فل کے مقالہ ''حیدر قریشی کی ادبی خدمات'' سے اقتباس

ایم فل کے وائیوا میں ذکر

ایک اطلاع کے مطابق ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ میں جب عامر سہیل صاحب کے مقالہ کا وائیوا ہوا تب ان سے ڈاکٹر عابد سیال صاحب نے دوسوال ایسے پوچھے جو براہِ راست امی سے متعلق تھے۔

پہلا سوال: حیدر قریشی کی اہلیہ کا کیا نام ہے؟

دوسرا سوال: حیدر قریشی نے اپنی اہلیہ کا جو خاکہ لکھا ہے اس کا عنوان کیا ہے؟

عامر سہیل صاحب نے دونوں سوالوں کے درست اور دلچسپ جواب دیئے۔

(نوٹ از مرتب شعیب حیدر)

مختلف ادیبوں کے مضامین/خطوط میں ذکر

ہماری شاعری میں بیوی سے محبت کا اظہار کم کم ہی ہوا ہے۔کمار پاشی نے اپنی بیوی کے تعلق سے لکھی ہوئی نظموں کا ایک پورا مجموعہ "اردھانگنی کے نام" سے شائع کیا تھا۔حیدر قریشی نے اپنی ازدواجی زندگی کے ساڑھے بارہ سال مکمل ہونے پر "نصف سلور جوبلی" کے نام سے جو نظم کہی ہے وہ ان کے جذبات کی شیفتگی کی آئینہ داری کرتی ہے۔انہوں نے "اردھانگنی" کے ساتھ اپنے بچوں کو بھی جزوِ حیات بنا دیا ہے۔**مظہر امام کے مضمون ''عمرِ گریزاں کی شاعری'' سے اقتباس**

بیوی کا خاکہ، جسے "رسماً" بڑی آسانی سے "اڑایا" جاسکتا تھا۔حیدر قریشی وہاں بھی مودب اور بیوی کی محبت میں ڈوبا دکھائی دیتا ہے۔حالانکہ کوئی بھی خاکہ نگار دل کی بھڑاس نکالنے کا ایسا سنہری موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔حیدر قریشی نے اپنے عزیزوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش تو کیا، ایسا خیال بھی اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا۔

قاضی اعجاز محور کے مضمون ''میری محبتیں'' سے اقتباس

خود حیدر قریشی اور ان کی بیوی مبارکہ کے درمیان لوگوں نے دیوار اٹھانے کی کوشش کی مگر صراحتاً یہ نہیں لکھا گیا کہ اسباب کیا تھے جن کی روشنی میں مذہبی ملاؤں نے جدائی کا اعلان کیا۔بہرحال حیدر صاحب نے کامیاب ازدواجی زندگی میں رخنہ پڑنے نہیں دیا۔

رؤف خیر کے مضمون ''میری محبتیں'' سے اقتباس

حیدر نے دیگر احباب کے ساتھ ان یادوں میں اپنے والدین، اپنی شریک حیات مبارکہ اور اپنے حقیقی دوست (خداتعالیٰ) کا ذکر بہت عمدگی سے کیا ہے۔

کرشن مہیشوری کے مضمون ''کھٹی میٹھی یادیں۔ایک مطالعہ'' سے اقتباس

''پسلی کی ٹیڑھ''میں آپ نے اپنی شریکِ حیات کا جس انداز میں تذکرہ کیا ہے اس سے بے انتہا مسرت ہوئی۔ورنہ عموماً ہمارے معاشرے میں والدین کے انتخاب کردہ شوہر بیوی میں زیادہ تر ساری عمر''سرد جنگ''سی جاری رہتی ہے۔وہ شریک سفر تو ہوتے ہیں'شریکِ زندگی نہیں۔

صفیہ صدیقی کے مکتوب سے اقتباس

حیدرقریشی نے ۱۹۷۸ء کے آخر میں ''جدید ادب'' کتابی سلسلے کے اجراء کا پروگرام بنایا۔(میری محبتیں،ص ۴۸)۔کتابی سلسلہ جاری ہوا،اس میں ان کی تمناؤں کا لہو شامل ہوا۔ہر شمارے کے ساتھ ان کا ایک آدھ زیور بِک جاتا۔اس اللہ کی بندی نے ایک دفعہ بھی تکرار نہیں کی۔جب تک ان کے زیور نے ساتھ دیا'جدید ادب'جاری رہا۔زیور ختم،'جدید ادب'بند۔(میری محبتیں ص ۸۳)

ڈاکٹر وسیم انجم کی کتاب ''حیدر قریشی فکر و فن'' کے ایک مضمون سے اقتباس

جرمنی اپنی فراخدلی کی وجہ سے مشہور ہے۔آپ اگر کسی Skin Head کے ہتھے نہ چڑھے تو آپ زندگی کا بقیہ حصہ(جسکے نہایت لمبا ہونے کا قومی امکان موجود ہے)نہایت عافیت سے گذاریں گے۔ہم سب یہاں خیریت سے ہیں۔بھابی مبارکہ کو میری اور ریحانہ کی طرف سے سلام اور مبارکباد بھی کہیں کہ آپ کو دوبارہ پا لیا ہے۔خواہ چھ ماہ بعد مجھے اس مبارکباد دینے پر کوسنے دیں۔آپ کا مخلص **اظہر علی** **(میجر اظہر صاحب کے مکتوب سے اقتباس)**

جہاں تک ان کی بیگم صاحبہ کے انٹرویو کا تعلق ہے۔اس سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ایک اہل قلم کی مصروفیات کس طرح ان کی بیویوں کے لئے سوکن کا کام دیتی ہیں۔اس انٹرویو سے ہمیں حیدرقریشی کی بے پناہ ادبی مصروفیات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اس کام کے لئے وقت کی کتنی

قربانی دیتے ہیں۔ **اسلم رسولپوری کے مضمون ''حیدر قریشی کے انٹرویوز'' سے اقتباس**

حیدر بھائی کی زندگی میں انٹرنیٹ کا ، بلکہ خود انٹرنیٹ کی زندگی میں حیدر بھائی کا اتنا عمل دخل ہو گیا ہے کہ جس اردو سائٹ پر جایئے وہاں وہ کسی نہ کسی روپ میں مل جائیں گے۔سنا ہے گھر میں ان کا زیادہ تر وقت کمپیوٹر کے ساتھ ہی گزرتا ہے۔یہاں تک کہ ان کی بیگم نے اسے اپنی سوت مان لیا ہے،اور بے چاری ہر دم بس کمپیوٹر کو ان سے خلع دلانے کی شرعی تدبیریں سوچتی رہتی ہیں۔

نصرت ظہیر کے مضمون ''حیدر بھائی پر ایک ادھورا مضمون'' سے اقتباس

حیدرقریشی احساس کمتری کا شکار نہیں ہیں۔کیونکہ انھوں نے جرمنی پہنچنے پر اپنے جن تاثرات اظہار کیا ہے۔ان سے بیوی کی برتری ثابت ہوتی ہے،اور یہ ان کی روشن خیالی و وسیع النظری ہے۔

ڈاکٹر لئیق صلاح کے مضمون ''کھٹی میٹھی یادیں کے تناظر میں'' سے اقتباس

جب حیدرقریشی صاحب کا فون ملا تو آواز اسی طرح ہشاش بشاش اور حوصلے جوانوں کی طرح بلند۔انہوں نے کہا رسالہ پڑھا ہے میں نے ہاں ہوں کر دی'انہوں نے اپنی گزشتہ سال دو سال کی بیماری قلب اور اپنی اہلیہ مبارکہ کی زندگی و موت سے کشمکش کی جو روداد سنائی تو میں نے سوچا ہر آدمی دکھ درد میں مبتلا ہے' کس کس کی داستان سنی جائے۔انہوں نے کہا میرے رسالے کے صفحات 225 تا238 پڑھ لیں آپ اپنی بیماری بھول جائیں گے۔میں نے فون بند کر کے بادل ناخواستہ کتاب کا وہ حصہ پڑھا تو واقعی اپنی بیماری بھول گیا'بعد ایک مدت کے میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر میرے گھر والے خوش اور حیران ہوئے' میں نے سب سے وہ مضمون پڑھوایا'اس دوران میں اپنی بیماری بھول گیا۔حیدرقریشی کے گھرانے پر بجلی کی طرح گرنے والی بیماریوں کا حال پڑھا تو یقین نہ آیا۔۔۔۔ خوش قسمتی سے وہ مہذب و مالدار ملک جرمنی میں تھا' جہاں اس کا اور گھر والوں کا ایسا علاج ہوا کہ حیدر پھر اٹھ کے چل پڑا'ان کی اہلیہ 13 برس سے بیمار ہے اور علاج کروا رہی ہے۔ان کے

گردے تقریباً فیل ہیں مگر شاباش ہے جرمنی کی فلاحی مملکت پر کہ انہوں نے مریض کو اپنی گاڑی بھیج کر روزانہ لانے لے جانے کا ذمہ بھی لے رکھا ہے' زیادہ ضرورت پڑے تو ہیلی کاپٹر بلا کر کسی اور بڑے ہسپتال پہنچا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے کالم دل پشوری سے اقتباس۔ روزنامہ 'آج' پشاور ۲۵ر جولائی ۲۰۱۰ء

حیدر قریشی کی تحریریں ہمہ جہت حیثیت رکھتی ہیں ان میں جہاں تحقیق و تنقید کے محاکے قاری کو دعوتِ فکر دیتے ہیں وہاں تخلیقی رنگ و آہنگ بھی اپنا جادو جگاتا نظر آتا ہے۔ اُن کی تخلیقی سرگرمیوں کا دائرہ خاصا وسیع ہے جس پر پاک و ہند کے علاوہ دیگر یورپی ممالک کے ادبا نے دل کھول کر داد دی ہے۔ قریشی صاحب نے اپنی تخلیقی نثر میں جہاں متنوع موضوعات پر خامہ فرسائی کی وہاں اہلِ خانہ کو بھی خاص اہمیت دی ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کی ادبی کہکشاں میں ہر رنگ کا ستارہ جھلملا رہا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں صرف اُن تحریروں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے جن کا تعلق اُن کی اہلیہ (مبارکہ) کے ساتھ ہے۔ اس حوالے سے اُن کی نمائندہ تحریر وہ خاکہ ہے جو اُنھوں نے ایک خاص کیفیت میں ڈوب کر لکھا ہے۔۔۔۔۔۔

حیدر قریشی نے زوجہ مبارکہ کا ذکر جہاں بھی کیا کمال محبت اور لگاؤ سے کیا ہے، ''کھٹی میٹھی یادیں'' کا آخری حصہ جہاں تمام اہم احباب کا تذکرہ روانی سے آگے بڑھتا ہے وہاں ایک بار پھر بہانے بہانے سے اہلیہ کی باتیں ہونے لگتی ہیں۔ ان باتوں میں مبارکہ کی بیماری کا احوال سامنے آتا ہے اور دوطرفہ محبت اور احترام کی کیفیات بھی لہریں مارتی نظر آتی ہیں۔

حیدر قریشی نے جب اپنا کلیات ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' مرتب کیا تو اس کا انتساب لکھتے ہوئے ایک بار پھر ''اظہارِ تشکر'' کا آغاز اپنی اہلیہ سے کیا ہے:

''اپنی اہلیہ مبارکہ کا شکریہ جس نے مجھے میری ساری خامیوں سمیت نہ صرف قبول کر رکھا ہے بلکہ مجھے ادبی کاموں میں ہر طرح کی سہولت بھی فراہم کرتی رہتی ہے۔''

یہ محبت کی کہانی مزید آگے بڑھتی ہے اور ''محبت کے پھول'' میں ایک پھول ادائے خاص

سے مبارکہ کی نذر کرتے ہیں:

اک روح کا قصہ ہے/ میرے بدن ہی کا/ جو گم شدہ حصہ ہے

(عمرِ لاحاصل کا حاصل: ص ۱۳۹)

ایک عام قاری کو بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حیدر قریشی کا رویہ اپنی اہلیہ کی جانب حد درجہ ہمدردانہ اور مشفقانہ ہے۔ اس حوالے سے ان کی ہر تحریر دردمندی اور احسان مندی کی کیفیت میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ حق سچ کی بات تو یہ ہے کہ بیوی کے حوالے سے یہ عمومی رویہ نہیں ہے۔ یہ ایسا خاص الخاص رویہ ہے جو ہر کسی کو ارزانی نہیں ہوسکتا، اور کہیں نظر آ جائے تو حیرت ضرور ہوتی ہے۔ اس نوع کی کیفیات کا صرف وہی شخص مکلّف ہوسکتا ہے جو ذہنی آسودگی سے مالا مال ہو، اپنی شریکِ حیات کو زندگی کی مسرتوں اور ازلی خوشیوں کا محرکِ اول مانتا ہو۔ حیدر قریشی کے فکری نظام میں اہلیہ کی علامت خوش بختی اور بے لوث محبت کا بلیغ اشاریہ ہے، اُنھوں نے اپنی تحریروں سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور یہ عورت بیوی بھی ہو سکتی ہے۔ حیدر قریشی کے اس خوب صورت ماہیے کے ساتھ بات تمام کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔

اظہار ضروری ہے/ پیارا گر ہو تو/ اقرار ضروری ہے

عامر سہیل کے مضمون ''حیدر قریشی کی تحریروں میں زوجہ مبارکہ کا ذکر'' سے اقتباس

اِن ادبی احباب کی جانب سے خطوط اور ای میلز کے ذریعے امی کی خیریت پوچھی جاتی رہی اور ذکر ہوتا رہا۔ بعض شخصیات نے فون پر براہِ راست امی سے باتیں کیں، اور کرتی رہتی ہیں۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)، شہناز خانم عابدی (کینیڈا)، ترنم ریاض (دہلی)، عامر سہیل (ایبٹ آباد)، حسن آتش (کلکتہ)، نسیم انجم (کراچی)، ڈاکٹر رضیہ اسماعیل (انگلینڈ)، ارشد خالد (اسلام آباد)، سعید شباب (خانپور)، ڈاکٹر رضیہ حامد (بھوپال)، فرحت نواز (رحیم یار خان)، نصرت بخاری (اٹک)، مسز اینڈ ڈاکٹر عبدالرب استاد (گلبرگہ)، ڈاکٹر نذر خلیق (راولپنڈی)۔

امی کے نام ابو کی

کتابوں کے انتساب

ابو کی مندرجہ ذیل کتابوں کا انتساب امی کے نام کیا گیا ہے۔

۱۔**سلگتے خواب** (پہلا شعری مجموعہ۔مطبوعہ۱۹۹۱ء۔اسلام آباد۔ص۱۴۴)

انتساب مبارکہ کے نام

اور نیچے یہ شعر درج ہے

استعارے تو کجا سامنے اس کے حیدر
شاعری ایک طرف اپنی دھری رہتی ہے

۲۔**And I Wait** افسانوں کا انگریزی ترجمہ (مطبوعہ۲۰۰۸ء۔دہلی۔ص۱۵۸)

Dedicated to
Life Partner
MUBARIKA

۳۔**اردو ماہیا تحقیق وتنقید** (مطبوعہ۲۰۱۰ء۔لاہور۔ص۵۵۶)

انتساب مبارکہ کے نام

اور نیچے یہ ماہیا درج ہے۔

اس حال فقیری میں
عمریں بیت گئیں
زلفوں کی اسیری میں

انٹرنیٹ کی دنیا

اس کتاب میں ابو کی جن کتابوں کے اقتباس دیئے گئے ہیں
وہ سب انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔دو مربوط بلاگس جہاں سے
ان کتابوں کو آسانی سے ڈاؤن لوڈ کیا جا سکتا ہے، یہ ہیں۔

ابو کی ہر کتاب الگ الگ

http://my27books.blogspot.de/

ابو کی کتابیں کلیات کی صورت میں

http://kuliat-library.blogspot.de/

ابو کے بارے میں لکھی گئی یا مرتب کی گئی کتابیں، ان کے انٹرویوز اور یونیورسٹیوں میں لکھے گئے مقالات اس بلاگ پر موجود ہیں۔

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/